فلسفہ مغرب کی تفہیم جدید

جدید مغربی فلسفہ پر جامعہ کراچی فلسفہ فکر کے بانی اور مربی کا محققانہ نقد

از

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش

Karachi University research forum

کرف .:۲۰۱۷.©

۳۰ ۔جولائی ۔۲۰۱۷۔

اشاعتِ برقیہ :دویم ۔

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش™

مونوگراف: فلسفہ مغرب کی تفہیم ِ جدید ۔

ترجمہ و تلخیص :

Rejecting Liberalism

بشکریہ :ماہنامہ ساحل،سید خالد جامعی اور ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ۔

کلید : جمہوریت،سماجیات،سیاست،مغرب،نو آبادیات،نسل کشی،قتل عام،جبریت ،لبرلازم،انفرادیت ،فلسفہ ،حکمت ،رالز، ہیبرماس، فوکالٹ، کانٹ، سیکولر ازم ،اشتراکیت ،ہیوم، لاک، مل وغیرہ ۔

پیشکش،فہرست،تہذیب و تقریظ :ڈاکٹر محمد علی جنید۔

www.facebook.com/kurf.ku

www.facebook.com/groups/kurfku

www.kurfku.blogspot.com

Karachi University Research Forum

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم ود انش

تقریظ

علم بھی بڑی عجب شہ ہے ،جو کبھی کسی امر کی معلومات پر مشتمل ہوتا ہے اور کبھی کسی شہ سے واقفیت کا نام ہوتا ہے،یوں بھی ہوتا ہے کہ واقعات اور حقائق سے شناسائی کو بھی علم کہا جاتا ہے.ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علم کا ایک دائرہ کار یا تو تخلیقات خداوندی سے متعلق ہوتا ہے یا مخلوق خداوندی کی بلواسطہ تخلیقات تک محیط ہوتا ہے

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب سے اہل وطن تو اتنا واقف نہیں ہیں ،جتنا میڈیا میں مشہور خام علمی شخصیات سےواقف ہیں . ،مگر بحرحال جامعات سے متعلق افراد اور وہ دانشوارانِ زمانہ جن کو خود علمیت کا گمان ہوتا ہے وہ انکی عمی تنقیدات سے اور ان سے کی جانے والی پس پشت خطوط بازی سے کامل آگاہ معلوم لگتے ہیں ،شرط یہ ہے کہ انکا ذاتی قدو قامت کم از کم خام علمی معیار کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو.

جاوید اکبر انصاری صاحب پاکستان کے وہ قابل تحسین ماہر مغربیات[1] اور سیاسی اقتصادیات[2] کے ماہر و نبض شناس ہیں جہونے پاکستان میں علم استشراق کے بلمقابل علم مغربیات و یورپیات کی داغ بیل باقاعدہ علمی و حکمتی سطح پر رائج کی،اور مغربی علمیت و فلسفیانہ برتری کی حقیقی شکل مغرب سے مرعوب زدہ حضرات کے سامنے اُجاگر کی ،ایسی ایسی فلسفیانہ موشگافیاں و نقطہ سنجیاں پیش کیں کہ دل سے دعائے خیر نکل کر چار سوں پھیل جاتی ہے .

أج کئی ماہرین مغربیات اگر میں غلطی پر نہ ہوں کی تحریروں سے برسبیل تذکرہ ایسے جملے انکے لئے نکل جاتے ہیں جن سے انکی مربیت اور استادی کا اندازہ ہونے لگتا ہے ،کچھ براہ راست اور کچھ بلواسطہ انکے فیض یافتہ ہیں ،جنکا ان سے تعلق تلمیذیت ظا ہر ہوتا ہے ان میں ڈاکٹر علی محمد رضوی،پروفیسر ذاھد صدیق مغل ،خاص الخاص ہیں ،جبکہ امین اشعر،محبوب رضوی،ڈاکٹر عبدالوھاب سوری ،سید خالد جامعی،محمد ظفر اقبال ، بھی انکی فکر کی شاخیں ہیں اس میں ہم اگر غلطی پر ہوں تو معاف کے خواستگار ہیں .

ویسے تو ڈاکٹر صاحب کی انگریزی تحریروں میں جو علمی معیار وسعت،روانی عروج پر نظر أتی ہے آوردو میں وہ شمع ذرہ کم لو سے چمکتی نکھرتی نظر أتی ہے مگر جوہری جب نوادرات چننے کی مہم میں مشغول ہوجائے تو کوہ نور ڈھونڈھ ہی لیتا ہے ،ڈاکٹر صاحب پاکستان میں لازماً نئے علم کلام کے بانیوں میں سے ایک ہیں ،جنہونے اُمت کو نقل کو عقل پر ترجیح دینے اور سلف و خلف علمائے اسلام کی پیروی کی تلقین و ترغیب دی ہے.

---

[1] occidentlist

[2] political Economy

انھونے لوگوں کو دعوت فکر دی کہ دیکھو یہ مغرب کیا ہے؟،تم بلأخر کیوں مرتی تہذیب سے مرعوب و خوفزدہ ہو یہ وہ شمع ہے جس کی لو بظاہر چمکیلی و اٹھکیلی ہے پر اس کا تیل سوکھ رہا ہے،حدت وشدت مانند پڑھ رہی ہے،انھونے بتایا کہ برتری و ترقی اسلام کے پیمانوں میں ہے ،تم علمی طور پر نہیں بلکہ دماغی مرعوبیت کے سبب مردہ ہوچکے ہو اہل یورپ کی أنکھوں سے دنیا کو دیکھنا چھوڑو یہ أنکھیں تو موتیا زدہ ہوگئی ہیں اور انکو جلد أپریشن کی ضرورت پڑیگی ،

سرچشمہ حق وصداقت،علم و عرفان قران و سنت ،وحی متلو و غیر متلو ہیں ، نا کہ فلسفہ و منطق کی علمی بدمعاشیاں ،ڈاکٹر پولی دادا صاحب نے بجا کہا ہے کہ فلسفہ وضع شدہ دقیق اصطلاحات پر ہٹ دھرمی سے مکالمہ کرنے کا نام ہے .

انہونے مغرب کی علمی برتری و فلسفہ،سیایات و معاشیات سے وہ وہ جواہر نکالے اور مغربی معجونوں اور مفردات و مرکبات علمیہ کا ایسا ابطال أڑایا اور دلائل کی گمراہیاں بخوبی اجاگر کیں کہ انسان ہکا بکا رہ گیا .

صاحب سمجھتے ہیں خود کو ہم موحد ، أیئنہ میں دیکھا خود کو تو کفر دکھا پیشانی پر

انکی تحریروں میں جگہ جگہ مجدد الف ثانی اور ولی اللھی تصوف چھلکتا محسوس ہوتا ہے اور جس سے متفق ہونا لازم نہیں وہ خود کو علما کی پاوں کی جوتی اور طالب دین جانتے ہیں ،غزالی اور امداد اللہ مہاجر مکی کو راہنما جانتے ہیں ،اور یہ اثر انکے عملی تلامذہ میں بھی منتقل ہوتا تصور نظر أتا ہے،مگر أن کی حسن نیت پر کلام کرنا زیادتی لگتی ہے ،ان سے کئی جگہ مذہبی اختلاف کیا جاسکتا ہے وہ امریکہ و مغرب کے ذہنی غلاموں بلخصوص حکومتوں کو کافر و فاسق کہنے سے بھی نہیں چوکتے .

سعودیہ اور پاکستان کی حکومتیں انکی تنقید کی نوک پر ہوتی ہیں مگر ساتھ ساتھ وہ افواج پاکستان سے بڑی توقعات رکھتے ہیں.

زیر نظر تحریر کہنے کو بڑی مختصر دکھتی ہے مگر اس میں مغربی فکر ،تصورات،جدیدیت ،مابعد از جدیدیت،ما بعد از طبیعات،خیر و شر،اقدار مغرب و مشرق،روما نیت،انسان پرستی و انسنی حقوق ،تنویریت ،مارکسزم ،حریت فکر وعمل ،لبرلازم ،سرمایہ داریت ،جمہوریت ،اقتصادیت ،سیاسیات،مارکیٹ و بازار کا فر ق،اموات انسانی و ربانی،فورڈازم اور مابعد فورڈازم جیسے تصورات کو واضح کیا گیا ہے تو ساتھ ساتھ اس میں مارکس ،ہیگل ،کانٹ ،نشطے ،برگساں ،فرائڈ ، سارتر، ہائیڈیگر ،وٹنگسٹائن ،فوکالٹ ،رالز، ہیبرماس جیسے عصری مفکرین کی فکر بھی ملے گی .

اس کتاب کے ساتھ اگر انکے لیکچرز پر مبنی انگریزی کتاب بھی دیکھ لی جائے تو عمدہ ہوگا یہ تحریر تفہیم مغرب پر اردو بلاشبہ سب سے مختصر و جامع تحریر ہے جو فلسفہ،سیاسیات اور معاشیات کے ریسرچ اسکالرزکے لئے بڑے کام کی شہ ہے۔[3]

مصنف سے علمی اختلاف مذہبی طور پر شاید ممکن ہو مگر اہل مغرب کی بابت تفہیم میں اتفاق کا عنصر اختلاف پر بھاری نظر آتا ہے باقی قاری اپنی آرا قائم کرنے میں کامل ازاد ہے۔

ڈاکٹر محمد علی جنید

---

[3] Rejecting LIberalism

(۸۶)چھیاسی	سرمایہ دارانہ ریاست کے لیے نظم و ضبط کا نیا تانا بانا:	123.
(۸۷)ستاسی	UNO اور عالمی ادارے کون قائم کرتا ہے؟	124.
(۸۹)نواسی	سرمایہ دارانہ ریاست کے جرائم:	125.
(۸۹)نواسی	سرمایہ داری میں جرائم صنعت بن جاتے ہیں:	126.
(۹۰)نوے	کیا مکالمہ......افہام و تفہیم ممکن ہے؟	127.
(۹۱)اکانوے	مغرب اور حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ:	128.
(۹۲)بانوے	مغرب اور ہندومت:	129.
(۹۲)بانوے	امام غزالیؒ کے طریقے پر مغرب کا محاکمہ:	130.
(۹۳)ترانوے	مغربی معاشیات اور جدید اسلامی معاشیات میں یکسانیت؟	131.
(۹۳)ترانوے	ایسا اجتہاد جو تقلید کو ممکن بنا سکے:	132.
(۹۴)چورانوے	متوازی غیر سودی نظام معیشت:	133.
(۹۵)پچانوے	معاشرے پر مسجد کی حکومت:	134.

پہلا باب

سرمایہ داری اور سرمایہ دارانہ نظام کیا ہے؟

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

مغرب اور فلسفہ مغرب عصر حاضر کا اہم ترین موضوع ہے مغربی تہذیب بظاہر ایک غالب، طاقت ور تہذیب کے دنیا بھر میں اثر و نفوذ کر رہی ہے لیکن مغربی تہذیب، مغربی فلسفے اور مغربی فکر کی اساس کیا ہے؟ مغرب اور فلسفہ اس کے مبادیات کیا ہیں؟ اس فکر کا صغریٰ و کبریٰ کیا ہے؟ اس کی علمیات Epistemology اور Ontology کیا ہے؟ اس فکر میں مابعد الطبیعیاتی سوالات کا کیا مقام ہے؟ اس سلسلے میں چند گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ ہم مغرب، مغربی فلسفہ، مغربی تہذیب، مغربی افکار اس کی تاریخ، ماہیت، حیثیت، حقیقت اور انسانی تاریخ پر اس کے اثرات سے واقف ہو سکیں اور اس کا اسلامی علمیات کی روشنی میں محاکمہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔

مغربی تہذیب کا ادراک کیوں ضروری ہے؟

اس وقت جس تہذیب کو دنیا میں غلبہ حاصل ہے وہ مغربی تہذیب ہے، اس تہذیب سے صرف اسلام کو نہیں بلکہ تمام مذاہب عالم کو شدید نوعیت کے چیلنج درپیش ہیں، مغربی تہذیب کے غلبے کے نتیجے میں مذاہب ایک ذاتی معاملہ بن کر طاق نسیاں کی زینت بن جاتے ہیں، اس لیے مذاہب عالم کے ماننے والوں کے لیے عموماً اور امت مسلمہ کے لیے خصوصاً مغربی تہذیب کا ایسا ادراک حاصل کرنا ضروری ہے جس کی بنیاد پر اسے رد کیا جا سکے۔ مغربی تہذیب کو سمجھنا، مغربی تہذیب سے واقف ہونا، مغربی تہذیب کی تردید کرنے کے قابل ہونا ہم سب کا فرض ہے۔ مجھ جیسے لوگ جو علوم دینیہ سے ناواقف ہیں ان کے

لیے یہ ممکن نہیں اوران کے لیے یہ مناسب بھی نہیں کہ وہ کسی عمل پر اسلامی حکم جاری کریں یہ ہمارے بس کی بات نہیں انہی معنوں میں ہم جیسے لوگ جو علوم دینیہ سے واقف نہیں علمائے کرام اور صوفیائے عظام کے خدام ہیں اور ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم مغربی تہذیب جس کی آغوش میں ہم پلے ہیں اور مغربی تہذیب جس کو سمجھنے میں ہم نے اپنی عمریں گزاری ہیں اس کی حقیقت، اس کی حیثیت اور اس کی ماہیت علمائے کرام اور صوفیائے عظام کی خدمت میں بیان کردیں اور ان سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ حکمت عملی جس کی بنیاد پر مغربی فکر فلسفے اور تہذیب کی تسخیر ممکن ہوگی وہ حکمتِ عملی علمائے کرام اور صوفیائے عظام ہی مرتب فرمائیں گے۔ کیونکہ وہی علوم دینیہ کے وارث ہیں اور وہی مغرب کا اسلامی علمیاتی محاکمہ کرسکتے ہیں۔

سرمایہ و جمہوریت معبودان حاضر:

مغرب کو سمجھنے کے لیے سرمایہ اور جمہوریت کی اصطلاحات اور ان کا تاریخی پس منظر سمجھنا ضروری ہے کیونکہ سرمایہ داری اور جمہوریت عصر حاضر کے دو معبود ہیں جن کی پرستش عالمگیر پیمانے پر کی جا رہی ہے اور ان مغربی اصطلاحات کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوششیں جاری و ساری ہیں ان اصطلاحات کا تاریخی پس منظر نظر انداز کر کے انھیں مجرد اصطلاح سمجھ کر ان کو سند جواز عطا کی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کیا چیز ہے؟ سرمایہ دارانہ معاشرہ کیا ہے؟ سرمایہ دارانہ عمل کسے کہتے ہیں؟ یہ اس باب کا موضوع ہے۔ دوسرا باب ذات اور اس کے تصور کے بارے میں ہوگا۔ مغرب کے تصور ذات اور تصور نفس کو بیان کرنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام جن مفروضات پر قائم ہوتا ہے وہ مفروضات واضح اسی وقت ہوتے ہیں جب مغربی فلسفے میں نفس اور ذات کے تصورات کا ادراک ہو سکے۔ لیکن یہ موضوع ذرا مشکل ہے۔ مغرب کے تصور انسان، تصور ذات اور تصور نفس کو سمجھے بغیر ہم سرمایہ داری اور جمہوریت کو نہیں سمجھ سکتے، اور اس بات کو بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ہم مغربی تہذیب کو کن بنیادوں پر کلیتاً رد کرتے ہیں اس تہذیب سے اختلاف کی بنیادیں کیا ہیں اور اسے کیوں ظلم اور طاغوت تصور کیا جاتا ہے؟ اور کیوں ہم مغربی تہذیب کو بالکلیہ ظلم کہتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ہم مغرب کے تصور فرد، مغرب کے تصور خیر اور مغرب کے تصور حیات سے بخوبی واقف ہوں لہٰذا اختصار کے ساتھ مغرب کے تصور ذات اور تصور حیات کو علمی بنیادوں پر سمجھنا ضروری ہے۔

اس وقت سرمایہ دارانہ نظام کی حکمت عملی یہ ہے کہ وہ اسلامی معاشروں اور اسلامی ریاستوں کو

عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ختم کرنا چاہتا ہے۔ قارئین عالمگیریت کے لفظ سے واقف ہوں گے اور (Globalization) کے تصور (Concept) سے بھی واقف ہوں گے۔ عالمگیریت وہ تحریک ہے جس کے نتیجے میں سرمایہ داری ہی کی عالمگیریت مقصود ہے چنانچہ سرمایہ داری کو سمجھے بغیر عالمگیریت کے عمل کو اس کی حقیقت کو اور اس کی ماہیت کو سمجھا نہیں جاسکتا۔

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادی قدر آزادی ہے

سرمایہ دارانہ نظام کیا ہے اور سرمایہ دارانہ معاشرہ اور معیشت کس نوعیت کا معاشرہ اور کس نوعیت کی معیشت ہوتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام وہ نظام ہے جس میں فرد آزادی کا طلب گار رہتا ہے۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادی قدر کیا ہے؟ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادی قدر آزادی ہے یہ آزادی کیا ہے؟ اور یہی مغربی فلسفے کی قدر مطلق ہے۔ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو چاہنا چاہے چاہ سکتا ہے وہ کسی کا پابند نہیں ہے وہ آزاد پیدا ہوا ہے لہٰذا اسے کسی الہامی ضابطے کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا سرمایہ دارانہ نظام وہ نظام ہے کہ جس میں جس قدر کا انسان طلبگا رہوتا ہے وہ آزادی ہے اور آزادی کی طلب اور آزادی کی جستجو بنیادی طور پر مارکیٹ میں کی جاتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام مارکیٹ پر مبنی نظام ہوتا ہے اس کا انحصار بازار پر نہیں ہوتا۔ مارکیٹ اور بازار میں بنیادی نوعیت کا فرق ہے، مارکیٹ اور بازار مماثل نہیں ہوتے۔ اس فرق کی تفصیل آئندہ واضح ہو جائے گی۔

تمام قسم کی خواہشات جائز اور یکساں ہیں:

سرمایہ دارانہ نظام میں آزادی کی طلب بنیادی طور پر جس فلسفے کی غماز ہے وہ یہ ہے کہ نفس میں جو خواہشات پیدا ہوتی ہیں ان خواہشات کو کسی اصول کی بنیاد پر مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ نفس کے اندر جو خواہشات پیدا ہوتی ہیں ان کو انسان محض جوڑتا (Concatinate) جاتا ہے۔ ان کی ترتیب (Order) اور درجہ بندی نہیں کرتا۔ ان کو خلط ملط کر دیتا ہے ان کی ترتیب جس طریقے سے وہ چاہتا ہے متعین کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ انسان نماز پڑھنا چاہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان لہو ولعب میں بھی مبتلا ہونا چاہتا ہے۔ دولت بھی کمانا چاہتا ہے۔ انسان ماں باپ کی خدمت بھی کرنا چاہتا ہے۔ مختلف متضاد خواہشات ہیں جو ایک شخص کے نفس میں موجود ہوتی ہیں اب ان خواہشات کے درمیان

ترتیب پیدا کرنے کے لیے آپ کے پاس ایک معیار ہونا چاہیے مثلاً یہ کہ آپ خدا کی رضا حاصل کرنا چاہتے ہیں تو نفس کی جو خواہشات ہیں ان کو ترتیب دینے کے لیے آپ کے پاس ایک پیمانہ ہونا چاہیے۔ اس پیمانے کی بنیاد پر آپ نفس کی تمام خواہشات کو مرتب کر سکتے ہیں۔اس عمل کو خواہشات کی درجہ بندی کرنا کہتے ہیں۔لیکن مغربی تہذیب اس بات کا انکار کرتی ہے کہ خواہشات جو انسان کے نفس میں موجود ہوتی ہیں ان کو ترتیب دینے کے لئے کسی قسم کا کوئی پیمانہ موجود ہے جیسے مثلاً رالس کہتا ہے:

Taking the sepratenessof the person seriously ،لوگوں کا جو فرق ہے،لوگوں کے اندر جو فرق ہے ۔لوگوں کے اندر جو تفریق ہے اس کو آپ قبول کیجیے۔تفریق کیا ہے یہی ہے کہ مختلف لوگ اپنے نفوس کے اندر جو خواہشات محسوس کرتے ہیں ان کو مختلف طریقے سے جوڑتے ہیں کوئی عبادت کرنے کو زیادہ پسند کرتا ہے کوئی دولت کمانے کو زیادہ پسند کرتا ہے کوئی ماں باپ کی خدمت کو زیادہ پسند کرتا ہے کوئی لذت حاصل کرنے کو زیادہ پسند کرتا ہے وغیرہ وغیرہ تو اس کی یہ انفرادی آزادی ہے کہ وہ جس طریقے سے چاہے جو خواہشات اس کے نفس میں موجود ہیں ان کو مرتب کرلے اور کوئی بنیادی اصول ایسا موجود نہیں جس کی بنیاد پر نفس کی خواہشات کی درجہ بندی کی جا سکے یہ ایک بنیادی مفروضہ ہے مغربی تہذیب کا۔

ہر شخص معیار حق خود متعین کر سکتا ہے:

ہر شخص خود معیار حق متعین کر سکتا ہے چنانچہ آزادی یہی ہے کہ ہم لوگوں کو حق دیں کہ وہ معیار خیر اپنے لیے خود متعین کرلیں کسی عالمگیر اصول(Universeal Principle)کے بغیر وہ اپنے لیے خود متعین کرلیں کہ ان کا معیار خیر،ان کا تصور خیر وشر کیا ہوگا ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک لوگوں کی شخصی(Personal) زندگی کا تعلق ہے جہاں تک لوگوں کی نجی زندگی کا تعلق ہے اس کے اوپر کوئی حکم لگانے کا معاشرہ اپنے آپ کو ذمہ دار محسوس نہیں کرتا ۔آپ کی نجی زندگی کس نوعیت کی ہے مثلاً رالس ہی کے ہاں جو بیسویں صدی کا مغربی سیاسی فلسفی ہے کہتا ہے کہ "اگر آپ کو اخلاقیات کا دائرہ متعین کرنا ہے تو پھر آپ نہیں کہہ سکتے کہ وہ آدمی جو خیر اس میں دیکھتا ہے کہ گھاس کے تنکے گنے ۔اس کا تصور خیر بہتر ہے یا اس آدمی کا جو منشیات کو ختم کرنا چاہتا ہے اس کا تصور خیر بہتر ہے یعنی تصور خیر تو ایک انفرادی معاملہ ہے اس میں آپ کو لوگوں کو آزاد چھوڑنا پڑے گا ہر آدمی اپنے لیے جو تصور خیر متعین کرنا چاہے متعین کر سکتا ہے

۔اسی کو پرائیویٹ لائف (نجی زندگی) کہتے ہیں ذاتی زندگی سے کیا مراد ہے؟ یہی مراد ہے کہ آپ کی اخلاقیات آپ کی ترجیحات کے مطابق خودساختہ ہوں گی ۔آپ اپنی ذاتی زندگی میں کس مقصد کو دوسرے مقصد پر فوقیت دیں گے۔یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے مغربی تہذیب کے لیے یہ ایک لایعنی سوال ہے ۔انہی معنوں میں ہم مغربی تہذیب کو غیر اخلاقی (Immoral) تہذیب کہہ سکتے ہیں ۔ایک ماورائے اخلاق (above the moral) تہذیب نہیں کہہ سکتے ۔

تعلقات کی بنیاد معاہدے ہیں :

حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ اخلاقی زندگی مغربی تہذیب میں لایعنی چیز ہے ۔لایعنی ان معنوں میں کہ اس عمل پہ جس کی بنیاد پر لوگ ایک تصور خیر کو دوسرے تصور خیر کے مقابلے میں بہتر سمجھتے ہیں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہر تصور خیر یکساں ہے کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں اور ان تصورات خیر کی بنیاد پر زندگی کے پیمانے مرتب نہیں کیے جاتے ۔مغرب میں تعلقات کی بنیاد معاہدوں پر ہے کوئی تعلق بغیر کسی غرض کے قائم نہیں رہ سکتا ۔لوگ اپنے تصورات خیر پر مبنی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے آپس میں معاہدے (contracts) کرتے ہیں مغربی معاشرے میں جس بنیاد پر تعلقات استوار ہوتے ہیں وہ contract ہے ۔جس جگہ کنٹریکٹ قابل عمل ہوتا ہے وہ مارکیٹ ہے ۔مارکیٹ میں کیا ہوتا ہے کہ مارکیٹ میں چند افراد جو مساوی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے مختلف تصورات خیر ہیں، وہ مارکیٹ میں آ کر اس بنیاد پر معاہدے کرتے ہیں کہ ان کے تصور خیر کو حاصل کرنے کے لیے ذرائع و وسائل ملیں یہ باہم مفید (matually beneficial) معاہدے ہوتے ہیں ۔باہم مفید اس معاملے میں کہ معاہدے کرنے والے ایک دوسرے کے برابر ہیں ۔برابر ان معنوں میں کہ ان کے تصورات خیر کو، جو کچھ بھی تصورات خیر ہوں، مساوی تصور کیا جاتا ہے ۔اب حقیقت یہ ہے کہ مارکیٹ اور مارکیٹ کا جو نظام ہے اس کے تحت معاہد گروہوں کو مساوی تصور کرنا ضروری ہے ۔یہ تصور زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ سوسائٹی میں ہر چیز مارکیٹ بن جاتی ہے ۔اب کچھ فلسفی ہیں سیاسی فلسفی مثلاً میکلغائر، رالس ر وغیرہ جو کہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ معاشرت کو آپ کچھ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں مارکیٹ سے علیحدہ عدل کے دائرے ہیں جہاں مارکیٹ کا عمل دخل نہیں ہے یا نہیں ہونا چاہیئے ۔ مارکیٹ کے معاملات کو ایک خاص حد تک محدود کرنا چاہیے اور اس ایک حد سے اس کو تجاوز نہیں کرنے دینا چاہیے ۔لیکن وہ کچھ بھی کہتے

ہوں حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ سوسائٹی اور سول سوسائٹی ایک ہی چیز ہے۔سرمایہ دارانہ سوسائٹی مارکیٹ سوسائٹی کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں اور اس چیز کا سب سے پہلے جس کو ادراک ہوا وہ ہیگل ہے جس نے اس کی تفصیل بیان کی تھی اسی لیے ہیگل کے ہاں بالخصوص اگر آپ فلسفہ حق (Philosophy of right) والا مضمون دیکھیں۔اس میں بھی اور دوسری جگہ بھی مارکیٹ سوسائٹی اور سول سوسائٹی کو ایک ہی چیز کے دو نام کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے۔آج کل آپ سول سوسائٹی کا بہت تذکرہ سنتے ہوں گے ۔ہمیں سول سوسائٹی بنانا چاہیے اور سول سوسائٹی انسٹیٹیوشنز کو فروغ دینا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔سول سوسائٹی سے مارکیٹ سوسائٹی ہی مراد ہے اور مارکیٹ سوسائٹی سے کیا مراد ہے مارکیٹ سوسائٹی سے مراد یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جس میں تعلقات کی بنیاد باہمی مفادات کے حصول کے لیے معاہدہ یا کنٹریکٹ پر ہو اور لوگوں کی نفسی اور روحانی کیفیت، ان کی اخلاقی کیفیت، ان کا اخلاقی مرتبہ کچھ بھی ہو، وہ اس معاہدے کی بنیاد پر برابر تصور کیے جائیں ان کے درمیان تعلقات کی بنیاد اس پر ہو کہ وہ ایک دوسرے سے ان تعلقات کو قائم کرکے جو کچھ بھی ان کا تصور خیر ہے اس کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے ذرائع و وسائل حاصل کریں۔لہٰذا ایک سرمایہ دارانہ معاشرے میں افراد کی اقداری حیثیت ہے، روحانی حالت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔سرمایہ دارانہ سوسائٹی اس فرق کو محسوس نہیں کرسکتی۔سرمایہ دارانہ سوسائٹی اس روحانی اخلاقی تصور سے یکسر خالی اور عاری ہوتی ہے۔اخلاق، روحانیت خیر کا اس کے پاس کوئی تصور ہی نہیں ہوتا۔وہ اس چیز کا اعلان کرتی ہے کہ ہر شخص کو حق ہے کہ وہ جو تصور خیر چاہے رکھے اور اس کا تعلق دوسرے سے محبت کی بنیاد پر نہیں ہوگا۔بلکہ بنیادی طور پر اس کا تعلق دوسرے شخص سے محض اور محض غرض کی بنیاد پر ہوگا وہ جب دوسروں سے تعلق بنائے گا تو فطری روابط کی بنیاد پر وہ تعلقات قائم نہیں کرے گا جیسا کہ روایتی معاشرے میں عموماً ہوتا ہے بلکہ وہ تعلق قائم کرے گا اس بنیاد پر کہ اس تعلق کے قیام کے نتیجے میں اس کو وہ وسائل، وہ مفادات، وہ ذرائع حاصل ہو سکتے ہیں یا نہیں جس کی بنیاد پر وہ اپنے تصور خیر کو حاصل کرسکتا ہے۔

بازار اور مارکیٹ میں کیا فرق ہے؟

اب یہاں سے آپ مارکیٹ اور بازار میں بنیادی فرق جانچ سکتے ہیں۔بازار وہ معاشی ادارہ ہے جو روایات اور اخلاقیات کے دائرے میں محصور و محفوظ رہتا ہے ہمارے اسلامی بازار میں قدر

(۷) سات

متعین کرنے کی قوتوں میں برادریوں کا اہم ترین کردار ہوتا ہے ۔امریکہ کا ایک مشہور مورخ پولیانی بیان کرتا ہے کہ "قدیم معیشتیں معاشرتوں کا حصہ ہوتی تھیں تعین قدر اس بات پر منحصر تھا کہ معاشرہ خیر کا کیا تصور رکھتا ہے، معاشرہ خیر کا جو تصور رکھتا تھا اس کا اظہار اور ادراک مثلاً مغرب میں گلڈ کے نظام کے ذریعے ہوتا تھا ہر گلڈ کا ایک رہبر و نگران بزرگ ہوتا تھا" ہمارے ہاں برادریوں کے اثر و نفوذ سے بازاروں کے ذریعے اس تصور خیر کا اقرار ہوتا تھا ہمارے ہاں تو بالخصوص بازاروں کو محدود کرنے والا حلال و حرام کا ایک پورا نظام موجود تھا چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام سے پہلے جس بازار کی ہم گفتگو کرتے ہیں مارکیٹ نے اس بازار کو مطلقاً تباہ کر دیا ہے ان معنوں میں تباہ کر دیا ہے کہ حلال و حرام کی وہ قیود اور معاشرے کے تصور خیر کی وہ قیود جن کی بنیاد پر بازار میں تعین اقدار ہوتا تھا وہ تباہ ہو گئیں وہ حدود و قیود ختم ہو گئیں اور یہاں تعین خیر و شر کی بنیاد صرف یہ رہ گئی کہ افراد جن کے تصور خیر ایک دوسرے سے مختلف ہیں ایسا معاہدہ کریں جو باہمی طور پر مفید ہو۔

سرمایہ آزادی کا دوسرا نام ہے:

اس بات کو سمجھنے کے لیے اس بات کو دیکھنا پڑے گا کہ جس وقت ہم یہ بات کہتے ہیں ہم اس چیز کو قبول کرتے ہیں کہ انفرادی سطح پر تصور خیر کچھ بھی ہو ہم اجتماعی سطح پر ہر تصور خیر کو یکساں مانیں گے۔ خواہ ہم دوسرے تصور کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں کیوں کہ تمام تصورات خیر ایک ہی قدر کی حیثیت رکھتے ہیں تو فی الواقع جس چیز کی ہمیں جستجو ہوگی وہ ہوگی آزادی، آزادی کا کیا مطلب ہے؟ آزادی کا یہ مطلب ہے کہ کنٹریکٹ معاہدے اس طریقے سے کیے جائیں کہ افراد اپنے تصور خیر کو حاصل کرنے کے زیادہ سے زیادہ مکلف ہو جائیں ان تصورات خیر میں ہم کسی قسم کی تفریق نہیں کریں گے لیکن فی الحقیقت ان تمام تصورات خیر کو ہم مارکیٹ کے تابع کر دیں گے۔ خیر مطلق کے اس عمل کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ آزادی لوگوں کو مل جائے کہ وہ اپنے تصور خیر کو حاصل کر سکیں اس مجرد تصور خیر کو سرمایہ (Capital) کہتے ہیں۔ سرمایہ کیا ہے؟ سرمایہ آزادی کا دوسرا نام ہے بلکہ سرمایہ داری میں آزادی کی جو شکل ہوتی ہے وہ کیپٹل ہی ہوتی ہے آزادی کس کو حاصل ہوتی ہے اس کو حاصل ہوتی ہے جس کے پاس سرمایہ زیادہ ہو اگر میرے پاس پیسے نہیں ہیں تو وہ تمام حقوق انسانی جن پر مغربی تہذیب کا اجماع ہے وہ میرے لیے قابل حصول نہیں ہیں۔ اگر میرے پاس پیسے نہیں تو میں کوئی اخبار نہیں نکال سکتا

میرے حق اظہار کے کوئی معنی نہیں ہیں ۔اگر میرے پاس پیسے نہیں ہیں تو میں جائیداد حاصل نہیں کر سکتا، حالانکہ مغربی مفکرین بالخصوص جو قدیم مغربی مفکرین یا اولین دور کے مفکرین ہیں وہ تو کہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ پراپرٹی حاصل کیے بغیر تو آزادی ممکن ہی نہیں چنانچہ اصل میں سرمایہ کیا ہے۔سرمایہ آزادی کی مجسم شکل ہے۔.Captal is the iconcrete form of freedom

تمام تصورات خیر یکساں نہیں ہو سکتے:

مغربی فلاسفہ کا یہ دعویٰ کہ فی الواقع تمام تصورات خیر ذاتی زندگی میں یکساں ہو جاتے ہیں جھوٹ اور غلط دعویٰ ہے ایسا نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مغرب نے ایک جانب یہ دعوی کیا کہ خیر یا مطلق خیر کوئی چیز نہیں ہے لیکن دوسری جانب جو مطلق تصور خیر ان کے ہاں موجود ہے وہ سرمایہ یا آزادی ہے جس کی بنیاد پر دیگر تمام تصورات خیر کو جانچا جاتا ہے اور تصورات خیر کی قبولیت یا عدم قبولیت اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ کس حد تک اس تصور خیر کو اپنا کر آپ سرمایہ حاصل کر سکتے ہیں ۔انہی معنوں میں ہم یہ بات کہتے ہیں کہ مارکیٹ ایک Colonizing phenomonon ہے مارکیٹ معاشرے کی ہر چیز کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔خاندان کو بھی اور قبیلے کو بھی ۔باپ بھی بیٹے سے یہ کہتا ہے تم کتنا پیسہ کماتے ہو تم نے کیا کیا ہے کہ تمھیں بہتر سے بہتر نوکری مل سکے ۔ہر معاشرتی عمل بنیادی طور پر سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل کے تابع ہو جاتا ہے۔کیپٹل سوسائٹی کون سی سوسائٹی ہے؟ وہ سوسائٹی ہے جس کا تصور قدر سرمایہ کی بڑھوتری ہے اور ہم کب کہتے ہیں کہ سوسائٹی مارکیٹیائز marketize ہو گئی ہے ۔ جب تمام تعلقات اور تمام اقدار سرمایہ کی بڑھوتری کے تابع ہو گئے ۔اس وقت ہم کہتے ہیں کہ یہ معاشرہ سرمایہ دارانہ معاشرہ ہو گیا ہے۔

مارکیٹ میں تصورات خیر برابر نہیں ہو سکتے:

سرمایہ دارانہ معاشرہ کے بارے میں عموماً یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس معاشرے میں فی الواقع لوگوں کے تصورات خیر مساوی ہوتے ہیں ۔جب کہ حقیقتاً کسی بھی سرمایہ دارانہ معاشرے میں لوگوں کے تصورات خیر ہرگز مساوی نہیں ہوتے ۔ مارکیٹ میں مساوی لوگ کنٹریکٹ نہیں کرتے، کبھی مساوی کنٹریکٹ نہیں ہوتے ۔یہ جھوٹ ہے۔لہٰذا یہ سرمایہ دارانہ نظریہ جھوٹ ہے۔یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں کنٹریکٹ برابری کی بنیاد پر ہوں۔سرمایہ دارانہ معاشرے میں معاہدے غیر مساوی

ہوتے ہیں مزدور کا انتظامیہ کے ساتھ معاہدہ ہے ۔صارف کا Finance Producer کے ساتھ معاہدہ ہے یہ ایک غیر مساوی معاہدہ ہے ۔ Producer کا افراد اور اداروں کے ساتھ معاہدہ غیر مساویانہ معاہدہ ہے وغیرہ وغیرہ ۔فی الواقع مساوات سرمایہ داری میں حاصل نہیں ہوسکتی ہے ۔یہ دعویٰ کہ کیپٹیلزم میں مختلف تصورات خیر برابر ہیں چنانچہ لوگ جب کنٹریکٹ کرتے ہیں تو ان کی حیثیت مساوی ہوتی ہے غلط اور جھوٹا دعویٰ ہے ایسا قطعاً نہیں ہے یہ حق ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں آزادی حاصل ہوتی ہے مگر آزادی کا مطلب کیا ہے، آزادی کا مطلب ہے سرمایہ کی بڑھوتری اس کے سوا آزادی کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہے ۔سرمایہ دارانہ معاشرے اور مارکیٹ کو بالکلیہ ہم شر کہتے ہیں ۔

آزادی کچھ نہیں عدم محض ہے:

سرمایہ داری محض دوسرا تصور خیر نہیں ہے بلکہ اسلامی تناظر میں گناہ اور کذب ہے یہ تصور خیر نہیں تصور شر ہے ۔یہ طاغوت اور باطل ہے سرمایہ داری وحی اور عبادت کو رد کرنے کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ آزادی کس چیز کی الٹ ہے عبادت کی ۔اگر ایک معاشرہ آزاد ہوگا اگر فی الواقع سرمایہ کی بڑھوتری کی بنیاد پر آپ تمام تصورات خیر کو مرتب کریں گے تو بنیادی طور پر آپ ایک ایسے نظام کو ترتیب دیں گے جہاں حرص اور حسد فروغ پائے گی ۔غضب اور شہوت فروغ پائے گا ۔اس معاشرے کا مقصد صرف سرمایہ کا حصول ہوگا ۔سورۃ تکاثر اس کوشش میں مصروف لوگوں اور معاشروں کی حقیقت نہایت بلیغ طریقے سے بیان کرتی ہے کہ مال دولت کی ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی اور قبر کی مٹی ہی اسے بھر سکتی ہے ۔لہٰذا سرمایہ دارانہ تصور معاشرت و معیشت وراصل طاغوت کی شکل ہے ہم سرمایہ دارانہ نظام اور مارکیٹ کو ان بنیادوں پر رد کرتے ہیں کہ اس کا تصور آزادی عبادت کے برعکس ہے ۔عبادت کا رد ہے ۔آزادی کیا ہے؟ آزادی کچھ نہیں ہے ۔آزادی عدم محض ہے ۔یہ محض ایک خلا ہے ۔کیوں؟ آپ یہ کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ آپ کے پاس کوئی تصور نہیں کہ خیر کیا ہے خیر محض یہ ہے کہ آپ وہ صلاحیت پیدا کریں کہ جس کی بنیاد پر آپ جو چاہیں کر گزریں ۔یہی تو مطلب ہے اس کا کہ تمام تصورات خیر ایک جیسے ہیں اور اسی بنیاد پر تو آپ جواز فراہم کرتے ہیں اس فکر کو کہ وہ وسائل حاصل ہوں جس کی بنیاد پر میں جو چاہوں کرسکوں ۔ کانٹ کا تصور جنت ارضی (Kingdom of End) اور مارکس کا تصور خالص اشتمالی معاشرہ سارتر کا تصور Hell is other People تمام کی تمام اسی فکر کا اظہار ہیں ۔ Freedom itself is

.nothing آزادی محض ایک خلا ہے۔سرمایہ کے بغیر آزادی کے کوئی معنی نہیں ہیں۔اب اسی چیز کو مارکیٹ کے عمل میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔مارکیٹ میں یہ اس طرح واضح ہوتی ہے کہ مارکیٹ میں قدر کا جو تصور ہے وہ اضافی (Relative) ہے۔Concept of Value Only relative ہے۔ ایک چیز کی قدر کیا ہے۔دوسری چیز کے مقابلے میں اس کی کیا قیمت ہے،مارکیٹ میں کیا چیز قدر کا اظہار کرتی ہے۔قیمت کیا ہے؟ ایک چیز کا بدل کوئی دوسری چیز اور اس کے لیے آپ نے ایک ایسا ذریعہ (Medium) دریافت کرلیا ہے جسے سرمایہ دارانہ پیسہ (Capitalist Money) کہتے ہیں جس کی اپنی کوئی قدر نہیں۔سرمایہ دارانہ پیسا اصل زر سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ اس کی اپنی کوئی قیمت نہیں، اپنی کوئی قدر نہیں۔سرمایہ دارانہ پیسہ جس وقت چاہے اسٹیٹ بینک آف پاکستان یا فیڈل ریزرو یا بینک آف انگلینڈ یا بینک آف یورپ پیدا کرسکتا ہے۔اوراس پیسے پر کمرشل بینک جتنا پیسہ چاہے بنا سکتے ہیں Capitalist Money قدر سے عاری ہے۔There is no value in capatilist money سرمایہ دارانہ پیسہ تو صرف اضافی قدر (Relative Value) کا اظہار ہے۔یہ کیوں ہے؟اس لیے کہ آزادی (Freedom) تو عدم محض (Nothingness) ہے۔آزادی تو کچھ نہیں ہے۔آزادی کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے۔اس کا نہ تو کوئی Content ہے نہ ہی اس کا کوئی جوہر (Substance) ہے۔

مغرب کے پاس خیر کا کوئی تصور ہی نہیں ہے:

مغرب کے پاس کوئی دوسرا تصور خیر موجود نہیں ہے مغرب نے الٰہی تصور خیر، الہامی تصورات خیر وحی الٰہی انجیل اور عیسائیت کو رد کیا اور اس بنیاد پر رد کیا کہ وحی قدر متعین کرنے کا پیمانہ نہیں بن سکتی تو اس کی جگہ وہ کسی چیز کو نہیں رکھ سکے اور ان کی پوری تاریخ میں ایک خلاء پیدا ہوگیا۔اس خلاء کو مغرب کی فکر اور فلسفہ آج تک پر نہیں کرسکا۔ چنانچہ مارکیٹ میں جس تصور خیر کا تصور دیا جاتا ہے وہ کوئی مطلق تصور خیر نہیں ہے ان معنوں میں یہ بات بالکل درست ہے کہ وہ تصورات خیر کی جگہ کوئی دوسرے تصورات خیر نہیں رکھ سکے چنانچہ قدر کو وہ ایک مہمل چیز سمجھتے ہیں اس لحاظ سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ داری (Capitalist) دراصل ایک لااخلاقی (a moral) نظام ہے جو قدر کو مہمل سمجھتا ہے صرف اضافی قدر کو درست متصور کرتا ہے۔لیکن عملاً یہ بات بالکل غلط ہے اس لیے کہ اس کے نتیجے میں جو اخلاق فروغ

پاتے ہیں وہ اخلاق رذیلہ ہیں وہ حرص وہوس اور شہوت وغضب ہیں ۔ وہ محبت، للّٰہیت، تقویٰ اور بزرگی نہیں ہیں۔ منطقی طور پر بھی سرمایہ دارانہ نظام ایک لا اخلاق نظام ہے اور عملاً اخلاق رذیلہ کے فروغ کا ذریعہ بننے والا نظام ہے۔

سرمایہ داری اخلاق رذیلہ کو فروغ دیتی ہے:

چونکہ سرمایہ داری میں کوئی تصور خیر موجود نہیں ہے اس لیے جس چیز کو سرمایہ داری فروغ دیتی ہے وہ شر ہے۔ اخلاق رذیلہ ہیں جو مذہب کی تعلیمات کا الٹ ہے۔ سرمایہ انسان کو اپنی پرستش کی طرف مائل کرتا ہے نفس کی پرستش کی طرف مائل کرتا ہے خدا کی بندگی سے انکار کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس معاشرے میں انسان کا نفس ہی الہٰ ہے انسان اسی معبود کی پرستش میں زندگی بسر کرتا ہے اور سرمایہ داری آزادی اسی معبود کی پرستش کو ممکن بنانے کے ذرائع ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام خود بخود وجود پذیر نہیں ہوتا:

سرمایہ دارانہ نظام کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی نہ کسی حد تک سمجھا جائے کہ سرمایہ دارانہ نظام وجود میں کیسے آتا ہے یہ کیسے ہوا کہ لوگوں نے صدیوں پرانی الہامی، تہذیبی، اقدار و روایات کو فراموش کر دیا۔ یہ بڑی اجنبی بڑی عجیب چیز ہے۔ مختلف اسلامی مفکرین کا خیال ہے کہ مغربی تہذیب وقتی اور حادثاتی چیز ہے۔ مغربی تہذیب ایک حادثہ ہے جیسے بابل نینوا، جیسے عاد و ثمود وغیرہ ایک حادثہ ہیں اور ہماری تہذیب، انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات ابدی (Universal) ہیں۔ تو یہ حادثہ کیسے رونما ہوا کہ مغربی تہذیب غالب آ گئی، سرمایہ دارانہ نظام غالب آ گیا؟ لوگوں نے یہ شر، یہ عجیب اور نامانوس بات قبول کر لی کہ فی الواقع کوئی خیر نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ انسانی معاشرے نے اس قدر ضلالت قبول کر لی۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ فطرتاً یہ نہیں ہوا۔ ہائیک (Hayck) جھوٹ بولتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ "سرمایہ دارانہ ادارے خود بخود وجود میں آ جاتے ہیں۔" یہ بات درست نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ ادارے خود بخود وجود میں نہیں آتے۔ ایسا نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشرہ خود بخود قائم ہو جائے۔ بنک خود بخود نکل آئیں اور بازار خود بخود مارکیٹ بن جائیں ایسا نہیں ہے۔ اس میں کلیدی کردار ریاست ادا کرتی ہے۔ بنیادی ایجنسی ریاست ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اس وقت قائم ہوتا ہے جس وقت ریاست سرمایہ دارانہ نظام کو قائم کرنا چاہتی ہے۔

تمام قوانین کا ماخذ امریکی قوانین ہیں:

سرمایہ داری کا عمل یورپ میں کیسے تشکیل پذیر ہوا اس کا جائزہ اور مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ یا شخصیت یا بازار فطری طور پر وجود پذیر نہیں ہوتے بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کو قائم کرنے کی بنیادی ایجنسی ریاست ہوتی ہے۔ ریاست ہی کے ذریعے سرمایہ دارانہ معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ اس کو مثال کے ذریعہ سمجھنے کے لیے دیکھیے مثلاً صرف دورِ حاضر ہی میں سرمایہ داری کو کس طرح عالمگیر بنایا جا رہا ہے۔ گلوبلائزیشن کا مطلب کیا ہے؟ مطلب صرف یہ کہ امریکی قوانین تمام معاملات ترتیب دینے کی بنیاد بن جائیں اگر آپ WTO کے مقاصد دیکھیں IMF کا عمل دخل انٹرنیشنل اکاؤنٹنگ باڈیز ہیں ان کے کام یا اسٹینڈرڈ سیٹنگ آرگنائزیشن ISO 9001-2 وغیرہ کا کام دیکھیں اور آپ یہ سوال اٹھائیں کہ یہ جو تم عالمی قوانین بنا رہے ہو ان کا ماخذ کیا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ ماخذ امریکی قوانین ہیں۔ بنیادی حقوق کی بات کرنے والے جب یہ کہتے ہیں کہ ہم حقوقِ انسانی کی بنیاد پر تمام معاشروں کو از سر نو ترتیب دیں گے وغیرہ۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ حقوقِ انسانی وغیرہ کہاں سے آئے ہیں یہ تو امریکی اعلانِ آزادی (Declaration of Independence) سے ماخوذ ہیں۔ فیڈرلسٹ پیپر کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔ آپ امریکی اعلانِ آزادی سے اقوامِ متحدہ کے عالمی منشور حقوق انسانی کا موازنہ کریں تو آپ کو نظر آئے گا کہ دونوں ایک ہی چیز کے دو ضمیمے ہیں۔ اسی طرح اگر آپ عالمی قوانین و حقوقِ ملکیت ، جو عالمی تنظیم برائے حقوقِ ملکیت نے Technology Region کے بارے میں بنائے ہیں، ان کا امریکی پیٹنٹ سسٹم سے موازنہ کریں تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ دونوں سو فیصد ایک ہی چیز ہیں۔

سرمایہ داری کا اصل محافظ امریکا ہے:

سرمایہ داری آج اگر عالمگیر ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ اسے عالمگیر بنا رہا ہے کیونکہ امریکا ہی فلسفہ سرمایہ داری کا خالق ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ امریکہ نے کچھ ایسی عالمی ایجنسیاں بنا دی ہیں کہ جن کے ذریعے وہ یہ کام کر رہا ہے خود براہ راست نہیں کر رہا۔ لیکن یہ تمام ایجنسیاں امریکی استعمار کے ہاتھ میں محض آلۂ کار ہیں۔ امریکی ریاست کی قوت سرمایہ داری کے پیچھے موجود نہ ہو تو سرمایہ داری کے عالمگیر ہونے کا کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔ کیا امریکی اقدار روایات فلسفے کو فطری تسلیم کر لیں۔ کیا اسے تسلیم کر لیا جائے کہ قانون فطرت یہی ہے کہ امریکا دنیا میں غالب ہو یا ہم یہ مان لیں کہ فی الواقع جو

امریکہ میں ہوا وہی عقل کا تقاضا ہے جس طریقے سے امریکی پیٹنٹ سسٹم بنا ہے وہی اصل طریقہ ہے اسی طریقے سے پیٹنٹ سسٹم بنا چاہیے۔امریکہ میں مالی (Financial) سسٹم جس طریقے سے چلتا ہے وہی عقل کا تقاضا ہے اور وہی مالی نظام کو چلانے کا اصل طریقہ ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی ملکیت ختم ہو جاتی ہے:

اصل بات یہ ہے کہ سرمایے کے پیچھے جس چیز کی قوت ہے وہ ریاست کی قوت ہے۔اگر ریاست سرمایہ دارانہ ریاست نہ ہو تو سرمایہ دارانہ نظام قائم نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ ہمیں IMF کی شرائط قبول کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے پاکستان میں سرمایہ داری کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ امریکی طریقوں کو یہاں نافذ کیا جائے امریکہ کے طریقے وہی ہیں جو IMF بناتا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام خود بخود فروغ نہیں پاتا سرمایہ دارانہ نظام خودرو پودا نہیں ہے۔کوئی فطری چیز نہیں ہے نہایت غیر فطری چیز ہے۔بالکل انسان کے نفس اور قلب کو مسخ کرنے والی چیز ہے۔اس کو نافذ کرنے کے لیے ریاستی جبر کے طور پر پوری دنیا میں IMF کی شرائط نافذ کی جا رہی ہیں اور جبر کے طور پر حقوق انسانی (Human Rights) پر مبنی استعمار اس وقت پوری دنیا کے اوپر نافذ کیا جا رہا ہے یہ کوئی فطری عمل یا کوئی عقلی تقاضا نہیں ہے۔

سرمایہ دارانہ معیشت میں ذاتی ملکیت ختم ہو جاتی ہے:

سرمایہ دارانہ معیشت اور دوسری معیشتوں میں دو بنیادی چیزوں کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ایک غیر سرمایہ دارانہ معاشرت کے سرمایہ دارانہ معاشرت میں تبدیل ہونے میں دو بنیادی چیزیں اہم ہیں پہلی چیز "سرمایہ دارانہ تصور ملکیت" ہے۔سرمایہ داری کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ تصور ملکیت کو قانونی تحفظ دیا جائے۔سرمایہ دارانہ تصور ملکیت کو اچھے طریقے سے سمجھ لینا چاہیے۔سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ تصور ملکیت میں ایک شخص قانونی (Corporate personality) تخلیق کیا جاتا ہے۔اب یہ شخص قانونی یا Corporate personality کیا ہے؟تصور یہ ہے کہ یہ ایک ایسا شخص قانونی ہے جو قلاش (Bankrupt) تو ہو سکتا ہے لیکن مر نہیں سکتا۔ذاتی ملکیت میں تصور یہ ہے کہ کسی شخص کی ملکیت ہوتی ہے، وہ مر جاتا ہے تو اس کے بعد اس کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے، تقسیم ہو جاتی ہے وغیرہ۔سرمایہ دارانہ تصور ملکیت میں تصور یہ ہے کہ کمپنی جب قائم ہو گی تو کمپنی

ایک شخص قانونی کی حیثیت اختیار کرلے گی اس قانونی شخص کا فرض کیا ہے؟ یہ ہے کہ جو کچھ مقدار سرمایہ اس کو میسر آئے اس کی بڑھوتری کو اصل پیمانہ بنا کر اپنے تمام تر معاملات کا تعین کرے۔ذاتی ملکیت میں کسی شے کا مالک اس بات کا مختار ہے کہ وہ اپنی ملکیت کے ساتھ جو کچھ چاہے کرے۔اپنے مال کو جس طرح چاہے استعمال کرے لیکن ایک سرمایہ دارانہ کمپنی اس بات پر مجبور ہے کہ جو مال اس کے اختیار میں ہے اس کی بڑھوتری کے سوا کسی دوسری چیز کو اپنے پورے تجارتی اور پیداواری عمل کی بنیاد نہ بنائے چنانچہ سرمایہ دارانہ کمپنی میں عملاً یہ ہوتا ہے کہ دو قسم کے Stake ہولڈر ہوتے ہیں ایک Stake ہولڈر کو کہتے ہیں شیئر ہولڈر، حصص حاصل کرنے والے، دوسرے ہوتے ہیں مینجرز (Managers) ۔ عملاً شیئر ہولڈر کمپنی کو چلانے میں کوئی حصہ نہیں لیتے اور تمام تر کارکردگی کا انحصار مینجرز پر ہوتا ہے فی الحقیقت سرمایہ دارانہ کمپنی کا کنٹرول مینجرز کے ہاتھ میں ہوتا ہے شیئر ہولڈرز کے ہاتھ میں نہیں ہوتا ۔شیئر ہولڈر محض مینجرز سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ تم ہمارے شیئر کی قدر (Value) کو بڑھاؤ اور اگر مینجرز اس شیئر کی قدر کو بڑھانے میں معاون نہیں ہوتے اور شیئرز کی قدر بڑھانے میں ان کی حکمت عملی ناکام ہو جائے تو ان مینجرز کو نکال دیا جاتا ہے وہ کمپنی ختم ہو جاتی ہے ۔ قلاش ہو جاتی ہے اس کے اثاثے قرض خواہوں (Debters) کو دے دیئے جاتے ہیں۔جو خود کارپوریٹ کمپنیاں ہوتی ہیں وہ خود اسی کام میں لگ جاتی ہیں اور شیئر ہولڈرز کے شیئرز کی قدر کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے عمل میں جت جاتی ہیں ۔فی الواقع سرمایہ دارانہ معیشت میں ذاتی ملکیت ہوتی ہی نہیں۔اس معاملہ میں سرمایہ دارانہ معیشت اور اشتراکی معیشت بالکل ایک جیسی معیشتیں ہیں ۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت میں ذاتی ملکیت ختم ہو جاتی ہے:

سرمایہ دارانہ معیشت نے ذاتی ملکیت کو اسٹاک مارکیٹ کے تحت ختم کیا ہے۔اشتراکی نظام میں کس چیز نے ذاتی ملکیت کو ختم کیا؟ ریاست نے یا قومیانے (Nationalization) کے عمل نے۔ اس سے قطع نظر فی الحقیقت دونوں نظاموں میں ذاتی ملکیت نہیں ہوتی ۔اشتراکیت بھی اصلاً سرمایہ داری ہے، فرق صرف طریقہ کار کا ہے ۔وہاں ملکیت بڑی بڑی کارپوریشن اور کمپنیوں کی ہوتی ہے، اشتراکیت میں اجتماعی ملکیت ہوتی ہے، دونوں نظاموں میں انفرادی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور زندگی کا واحد مقصد آزادی اور آزادی کے حصول کے لیے سرمایہ کی بڑھوتری اور مسلسل بڑھوتری رہ جاتا ہے ۔صرف طریقے

مختلف ہوجاتے ہیں۔سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ کا اصل مالک فی الواقع کوئی فرد نہیں بلکہ سرمایہ خود ہوتا ہے، سب سرمایے کے غلام ہوتے ہیں سرمایہ دارانہ نظام میں طبقات نہیں ہوتے۔ایسا نہیں ہوتا جیسا مارکسسٹ کہتے ہیں یہ لیبر کلاس ہے وغیرہ بالکل نہیں۔سرمایہ دارانہ نظام میں ہر شخص سرمایے کا خادم ہے اوراس کی قدر اس بنیاد پر متعین ہوتی ہے کہ وہ سرمایے کی بڑھوتری میں کتنا اضافہ کرتا ہے۔ہر شخص کے عمل کو اسی طریقے سے ناپا جاتا ہے۔

آزادی کا مطلب سرمایے کی غلامی:

آزادی کی حقیقت کیا ہے سرمایے کی غلامی۔سرمایے کی غلامی کے سوا آزادی کی کوئی حقیقت نہیں۔اورسرمایہ دارانہ نظام میں سرمایے کی غلامی پر انسان مجبور رہتا ہے۔محض یہ نہیں کہ وہ اسے اختیار کرتا ہے، ماں بیمار ہے دوا کہاں سے لاؤں گا۔اگر میری تنخواہ میں اضافہ نہ ہوا تو تعلیم کہاں سے لوں گا اگر مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہے تو سرمایے کے حصول کے بغیر میں تعلیم کیسے حاصل کرسکوں گا۔چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام انسان کو سرمایے کی غلامی پہ مجبور کرتا ہے یہی آزادی کا مطلب ہے عملاً آزادی کا کوئی دوسرا مطلب نہیں۔آپ اس کو کوئی نام دوسرا دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں لیکن حقیقتاً، عملاً، تاریخی تسلسل کے طور پر آزادی کا مطلب سرمایہ کی غلامی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں کارپوریٹ ملکیت ذاتی ملکیت کی جگہ لیتی ہے:

سرمایہ دارانہ نظام میں بھی اشتراکیت کی طرح ذاتی ملکیت ختم ہوجاتی ہے۔سرمایے کی بالادستی قائم ہوجاتی ہے۔حقیقتاً ہر شخص اجرت کمانے والا ہوجاتا ہے۔ The wage form is universalized ہر آدمی بس ایک مزدور ہے جسے اجرت مل رہی ہے۔مزدوری کیا ہے؟ یہ کہ آپ اپنے وقت کو بیچتے ہیں یہ صحیح ہے کہ مزدوری غلامی نہیں ہے لیکن عملاً یہ سرمایہ کی غلامی ہی کا دوسرا نام ہے۔ آپ نے اپنا وقت بیچ دیا اس کے بعد جس نے خریدا ہے وہ جو بھی چاہے آپ سے معاملہ کرے اور جس نے خریدا ہے وہ خود ایک مجبور محض ہے وہ کیا کرواسکتا ہے وہی کرواسکتا ہے جس کے نتیجے میں سرمایہ کی بڑھوتری ہو۔چنانچہ ہر شخص غلام ہے اور اجرت کما رہا ہے۔جو لوگ اجرت نہیں کما رہے ہیں وہ ڈیویڈنڈ(Dividend) کمارہے ہیں یا سود کما رہے ہیں یہ سب کے سب اس بات پر انحصار کرتے ہیں کہ سرمایے کی بڑھوتری کیسے ممکن بنائی جائے؟ چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیت ہے کہ اس میں ملکیت

ختم ہوتی ہے ذاتی ملکیت کی جگہ کارپوریٹ ملکیت لے لیتی ہے۔کارپوریٹ ملکیت کے جگہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ مزدوری عالمگیری طریقہ ہوجائے۔ہر شخص مزدور بن جائے۔اس سب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ Financial Market غالب (Dominant) ہوتی چلی جاتی ہے۔

اصل بازار سود اور سٹے کے ہیں:

اصلی بازار جو سرمایہ دارانہ معیشت میں فی الواقع قدر متعین کرتے ہیں وہ دو بازار ہیں سود کا بازار اور سٹے کا بازار۔اصلی جگہ جہاں قدر متعین ہو رہی ہے وہ سود اور سٹہ کے بازار ہیں۔اس لیے کہ یہ دونوں وہ بازار ہیں جہاں منافع کا حصول ممکن بنایا جارہا ہے۔منافع کمایا کہیں بھی جارہا ہو چاہے پیداوار (Production) میں کمایا جارہا ہو یا تقسیم اشیا کے ضمن میں کمایا جارہا ہو، منافع کا حصول صرف فنانشل مارکیٹ کے ذریعے ہی ممکن ہوگا۔چنانچہ ہر شے (commodity) کی مارکیٹ اور ہر Factor مارکیٹ، یا کار کا بازار، پنکھے کا بازار، افراد کی محنت کا بازار وغیرہ وغیرہ یہ سب جو ہیں، ان کی قدر سود اور سٹے کے بازار میں متعین ہو رہی ہے۔

قیمتیں سود اور سٹے کے بازار متعین کرتے ہیں:

سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ داری نے کس چیز کو عام کیا ہے وہ سود اور سٹہ ہے۔یہی دو اقدار بازار میں قیمتوں کا تعین کرتی ہیں جو چیز عملاً عالمگیر ہوئی وہ سود اور سٹہ ہے۔جتنی بھی مارکیٹیں ہیں سب اس کے زیرِ تسلط آ گئیں۔جتنی بھی پیداواری (Production) مارکیٹ، تبادلے کی (Exchange) مارکیٹ اشیاء (commodity) کی مارکیٹ، Factor مارکیٹ سب فنانشل مارکیٹ کے زیرِ تسلط آ گئی ہیں اور قدر (Relative Value) مارکیٹ میں متعین ہو رہی ہے۔جہاں سود اور سٹہ کمایا جارہا ہے وہیں منافع کا حصول ممکن (Realize) ہو رہا ہے۔ظاہر ہے کہ سود اور سٹہ کی بنیاد پر جو قدر متعین ہوتی ہے اس کے اندر سرمایہ داری کی بنیادی غیر عقلیت (Irrationality) واضح ہوتی ہے سرمایہ داری بنیادی طور پر ایک غیر عقلی (Irrational) نظام ہے ایسا نظام ہے جو عقل کے خلاف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ فنانشل مارکیٹ ہمیشہ بحران کا شکار رہتی ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشتوں میں اس بات کا ہمیشہ امکان رہتا ہے کہ فنانشل مارکیٹ میں ایک بحران (Crisis) رونما ہو جائے۔کیوں؟ اس لیے کہ سرمایہ دارانہ معیشتوں میں منافع (Profit) کا جو حصول ممکن (Relize) ہوتا ہے وہ تخمین وظن کی بنیاد پر ہوتا

ہے۔ میں اس پہ داؤ لگاتا ہوں کہ یہ کمپنی اگلی دفعہ کتنا منافع (Profit) کمائے گی وہ اتنا منافع (Profit) نہیں کماتی، میرا داؤ خالی گیا۔ اگر ادائیگیوں (Obligations) اور دعووں (Claims) کے درمیان توازن (match) مستقل قائم نہ رکھا جاسکے تو ہر وقت اس کا امکان ہے کہ دعوے (Claim)، ادائیگیوں (Obligations) سے زیادہ ہو جائیں یا ادائیگیاں (Obligations)، دعووں سے (Claims) سے زیادہ ہو جائیں اور سرمایہ داری کی عمارت آناً فاناً زمین پر آگرے۔ اسی لیے سرمایہ دارانہ ریاست کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس بحران (Crisis) کا مقابلہ (Tackle) مرکزی بینک کرے۔ اگر آزادانہ مسابقت و مقابلہ مارکیٹ کا اصل جوہر ہے تو مرکزی بینک دنیا بھر میں بحران کے موقع پر کیوں مداخلت کرتا ہے۔ امریکی فیڈرل ریزرو بینک نے جیسے میکسیکو کے بحران میں اور جیسے مشرقی ایشیاء کے بحران میں جو کردار ادا کیا وہ آپ نے دیکھا چونکہ سرمایہ دارانہ تصور قدر ایک غیر عقلی (Irrational) تصور ہے لہٰذا عملاً جو تخمینے لگائے جاتے ہیں قدر کی حیثیت کے بارے میں وہ قابل حصول (Relize) نہیں ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس کا امکان موجود ہتا ہے کہ سرمایہ دارانہ بازاروں میں بحران موجود رہے۔ اس بحران میں سرمایہ دارانہ بازار کو بچانے کے لیے جو ایجنسی کام کرتی ہے وہ سینٹرل بنک ہے۔ سینٹرل بینک کے پاس بحران سے نبرد آزما ہونے کا جو آلہ ہے وہ مانیٹری پالیسی (Monetry Policy) ہے۔ اس آلہ کی ماہیت پر غور کرنے سے اس بات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کو الٹا (Over Throw) کیا جاسکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کبھی شروع ہوا ہے تو کبھی ختم بھی ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر وہ قوتیں کام کر رہی ہیں جو اس کو تباہ کر دیں گی۔ فنانشل (Financial) مارکیٹیں سرمایہ داری کی اس کمزوری کے اظہار کا ایک طریقہ ہیں۔

سرمایہ دارانہ ریاست کے تقاضے:

جب ہم سرمایہ داری پہ گفتگو کرتے ہیں تو دراصل تین سطحوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ شخصیت، سرمایہ دارانہ معاشرہ اور سرمایہ دارانہ ریاست۔ ان تینوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور سرمایہ دارانہ معاشرے ہمیشہ منضبط (Regulated) معاشرے ہوتے ہیں۔ ان معنوں میں کہ سرمایہ دارانہ معاشروں کو اور سرمایہ دارانہ معیشتوں کو ضابطے کا پابند رکھنے اور منضبط کرنے کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔

اس کام کا تمام تر دارومدار صرف اور صرف ریاست پر نہیں ہوتا۔ نجی شعبہ (Private Sector) بھی سرمایہ دارانہ معاشروں کو منضبط کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اس لیے عملاً اور حقیقتاً قوت کی تقسیم اور قوت کی ترتیب سرمایہ دارانہ معاشرے کے انضباط کا کام انجام دیتی ہے اور عموماً ابھی تک تاریخ میں یہ ریاست کے ذرائع سے ہی ممکن ہو سکا ہے۔ چنانچہ بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ ریاست کا کیا وظیفہ ہوتا ہے؟ سرمایہ دارانہ ریاست کا یہ وظیفہ ہوتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو ممکن بنائے اور انہیں قائم رکھے جن پر سرمایہ داری کے تسلسل کا انحصار ہے۔ بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ ریاست اس چیز کا ادراک رکھتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظم معیشت اور سرمایہ دارانہ نظم معاشرت اور سرمایہ دارانہ نظم ریاست بھی ختم ہو سکتے ہیں، ان کو عبور کیا جا سکتا ہے ان سے ماوراء اٹھا جا سکتا ہے لہٰذا سرمایہ دارانہ ریاستیں سرمایہ دارانہ معاشرت اور معیشت کو ناقابل عبور بنانے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ سرمایہ دارانہ معاشرت اور معیشت ہمیشہ قائم رہے اور سرمایہ دارانہ تصور معاشرت و معیشت پر غیر سرمایہ دارانہ تصور معیشت و معاشرت فتح نہ پا سکے۔

حرص و حسد کی عالمگیریت سرمایہ دارانہ اخلاقیات کے اجزاء:

سرمایہ داری کے غلبے کے لیے جو تین وظائف ان ریاستوں کو ادا کرنے ہوتے ہیں اگر وہ ان وظائف کو ادا کرنے میں ناکام ہوتی ہیں تو سرمایہ داری کی دائمی حیثیت کو مختلف خطرات پیش آئیں گے۔ سرمایہ داری ان خطروں سے نبرد آزما نہیں ہو سکے گی۔ یہ تین وظائف کیا ہیں؟ پہلی چیز تو یہ ہے کہ حرص و حسد کو عالمگیر کیا جائے انسان اس چیز کو مستقل قبول کرتا رہے کہ زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ صرف (Comsumption) جسے آپ ویلفیئر (Welfare) کہتے ہیں۔ ویلفیئر فنکشن اگر آپ Macro اکنامکس میں دیکھیں تو اس کا مقصد یہ ہے کہ ویلفیئر کو زیادہ سے زیادہ (Maximize) کیا جائے۔ اس کو میکرو اکنامکس کی زبان میں کہتے ہیں Welfare is discounted comsuption over a given life time. مطلب یہ ہے کہ زندگی میں مجموعی طور پر کتنا خرچ کر سکے یہی ویلفیئر ہے۔ یعنی آپ نے اپنی زندگی میں کتنا زیادہ خرچ (صرف) (consume) کیا۔ اب صرف کرنا اگر زندگی کا مقصد ہو اور زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کرنا زندگی کا مقصد قرار دیا جائے تو جس اخلاقیات کو اس فلسفے کی بنیاد دینا پڑے گا وہ حرص و حسد کی اخلاقیات ہو گی۔ اس اخلاقیات کو سرمایہ دارانہ نام (competition and accumulation) (مسابقت اور بڑھوتری برائے

بڑھوتری)۔حرص جو ہے بڑھوتری برائے بڑھوتری ہےاور حسد جو ہے وہ مسابقت ہے تو سب سے پہلی ضرورت سرمایہ دارانہ معاشرے کو قائم رکھنے کی یہ ہے کہ حرص اور حسد عالمگیر ہوں ہر آدمی حرص و حسد کا بندہ بن جائے ۔دوسری چیز یہ ہے کہ انسان یہ تصور کرے کہ کائنات ابدی ہے سرمایہ کی بڑھوتری کے ذریعے ہر انسان اس ابدیت میں شریک ہو جائے ۔کائنات ابدی ہے وہ کبھی ختم نہیں ہوگی انسان کی اپنی زندگی اگر ختم بھی ہو جائے گی تو وہ اتنا سرمایہ جمع کر لے گا کہ اس جمع شدہ سرمایہ (accumulated capital) میں اس کی شخصیت کی شمولیت باقی رہے گی ۔یہ بڑا پرانا خیال ہے ارسطو کے وقت سے یہ خیال ہے کہ کائنات ابدی ہے اور یہ مغربی تہذیب کا ایک بنیادی مفروضہ ہے کہ موت کو بھول جاؤ۔دوسری چیز جس پر سرمایہ دارانہ معاشروں میں گفتگو ختم ہو جاتی ہے اور جس میں کوئی بھی ڈائیلاگ یا کلام (Discourse) نہیں ملتا وہ موت پر گفتگو (Discourse of Death) ہے ۔موت کا کوئی تصور سرمایہ دارانہ معاشرے میں فروغ نہیں پاتا ۔کوشش یہ ہے کہ آپ کائنات کو ابدی تصور کریں اگر یہ دونوں چیزیں ممکن نہیں ہوتیں تو سرمایہ دارانہ شخصیت فروغ نہیں پاسکتی ۔تیسری چیز یہ ہے کہ آپ اس کو قبول کریں کہ سرمایہ داری میں تمام تر عدم مساوات کے باوجود،اس کے باوجود کہ آپ کی حیثیت سرمایہ دارانہ معاشرے میں ابتر ہو اس کے مواقع ہمیشہ موجود رہتے ہیں کہ آپ اپنی پوری کوشش اور جستجو کے ذریعے اپنے آپ کو سرمایہ کا بہترین خدمت گر ثابت کریں اس خدمت کے نتیجے میں آپ کو وہ انعام دیا جائے گا جو سرمایہ کی خدمت کرنے کا لازمی صلہ ہے چنانچہ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں ترقی اور مادی ترقی کے بہت زیادہ مواقع دستیاب ہوتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ یہ مواقع ہر ایک کو نہیں بلکہ ایک خاص اقلیت کے لئے فراہم ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو سرمایہ کی خدمت کے لئے سب سے اہل ترین فرد ثابت کر سکے ۔

سرمایہ دارانہ ریاست کے تین بنیادی کام:

سرمایہ دارانہ ریاست کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ تینوں چیزوں کو قائم رکھے ۔(۱) حرص وحسد کی عالمگیریت ،(۲)ابدیت دنیا اور(۳)تصورِ موت کا انکار اور فرار ۔سوال یہ ہے کہ فی العمل سرمایہ داری نے اس نوعیت کی شخصیت اور اس نوعیت کی معاشرت کیسے قائم کی ۔سرمایہ داری پر بیسویں صدی میں دو دور گزرے ہیں ایک دور کو کہتے ہیں فورڈازم Fordism اور دوسرے دور کو کہتے ہیں پوسٹ فورڈازم Post Fordism۔دونوں ادوار میں ریاست اور معاشرے کا تعلق مختلف رہا ہے ۔اور فرد اور

اجتماعیت کا تعلق بھی مختلف رہا ہے۔تو فورڈازم اور پوسٹ فورڈازم وہ طریقے، وہ نظام تعلقات اور وہ ضوابط ہیں،جن کے تحت سرمایہ دارانہ معاشرے کو بیسویں صدی میں منضبط کیا گیا۔بالخصوص دوسری جنگ عظیم کے بعد۔

فورڈازم اور پوسٹ فورڈازم:

میں کوشش کروں گا کہ اختصار کے ساتھ (Fordism)اور (Post Fordism) کا ایک تعارف پیش کروں یہ اس لیے ضروری ہے کہ عملاً سرمایہ دارانہ نظام کو کیسے قائم رکھا جاتا ہے اس کو سمجھنے میں مدد ملے۔یہ عرض کرنے کے بعد کے بیسویں صدی میں مغربی تہذیب کے ارتقاء پر چند گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ سرمایہ داری اور جمہوریت ایک خاص تصور فرد اور ایک خاص تصور خیر پر قائم ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم مغربی تہذیب کے بنیادی فلاسفہ کے افکار و نظریات کا اسلامی محاکمہ مرتب کریں۔اس ضمن میں مغربی فلاسفہ کے خیالات کا ایک بنیادی تعارف (Introduction) عالم اسلام اور علمائے کرام کے سامنے پیش کرنا اس لیے ضروری ہے تا کہ ان کے نظریات کا اسلامی مفکرین اور علمائے کرام اسلامی محاکمہ فرمائیں۔

فورڈازم[۱۹۸۰-۱۹۳۳ء] نئی اجتماعیتوں کا ظہور و اجتماعی حقوق:

Fordism سرمایہ دارانہ نظام کی وہ تعبیر ہے یا وہ تنظیم ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد سے لے کر تھیچر اور ریگن کے برسر اقتدار آنے تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رہی یعنی اس کا تاریخی دورانیہ 1933ء میں روزویلٹ کے صدر بننے سے لے کر 1980ء تک قائم رہا اس کا زمانہ عروج 1945ء کے بعد کا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام کے فروغ اور استحکام کے لیے اجتماعیت کے قیام کی ضرورت اور اہمیت اس تنظیم کے وجود کا جواز بنی۔سرمایہ دارانہ نظام جس معاشرے پر مسلط کیا گیا اس معاشرے کی جو فطری اجتماعیتیں تھیں وہ شکست و ریخت کا شکار تھیں۔ایک طرف مذہبی یعنی عیسائی اجتماعیت تھی دوسری طرف قوم پرستانہ اجتماعیت تھی۔دوسری جنگ عظیم کے بعد بالخصوص سوویت روس کے عروج کے نتیجے میں ایک تیسری نوعیت کی اجتماعیت مغربی تہذیب میں ابھرنے لگی اور یہ اجتماعیت کلاس کی بنیاد پر قائم ہونے والی اجتماعیت تھی یہ وہ اجتماعیت تھی جس کی بنیاد پر مزدور طبقہ اپنے حقوق کا مطالبہ بحیثیت ایک اجتماعیت کے کرنے لگا۔یہ اجتماعیت سرمایہ داری کے خلاف ایک چیلنج ثابت ہو سکتی تھی۔اس اجتماعیت کو سرمایہ دارانہ

نظام میں ضم کرنے کے لیے ایک خاص حکمت عملی اپنائی گئی جس میں مزدوروں کو یہ حق دیا گیا اور مزدوروں کا یہ حق تسلیم کیا گیا کہ وہ سرمائے کے ساتھ اجتماعی طور پر سودے بازی (Bargain) کر سکیں ۔ اجتماعی طور پر اپنا حق سرمایہ دارانہ نظام سے حاصل کر سکیں چنانچہ جو پرانی اجتماعیتیں تھیں یعنی عیسائی اجتماعیت اور قوم پرست اجتماعیتیں انہیں پس پشت ڈال کر عام آدمی کو ایک ایسی اجتماعیت میں ضم کیا گیا جس کا مقصد وجود سرمائے سے اپنا حصہ وصول کرنا تھا جس کی بنیاد پر یہ اجتماعیت قائم کی گئی وہ یہ کہ سرمائے کی بڑھوتری سے سب کا فائدہ ہے لیکن سرمائے کی بڑھوتری میں حصے کی تقسیم منصفانہ نہیں ہوتی ۔ فی الواقع حصے کی تقسیم ایسے ہوتی ہے کہ سرمائے کے منیجر اور سرمائے کے مالک زیادہ حصہ لے جاتے ہیں مزدوروں کو جو حصہ ملتا ہے وہ کم ملتا ہے ۔ چونکہ مزدور سرمایہ کار کے مقابلے میں نہایت کمزور ہوتا ہے اس کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ برابری کی بنیاد پر سودے بازی (Equal Bargaining) کر سکے اس کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ مساویانہ معاہدہ (Contract) کر سکے لہٰذا اس کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ اس کی ایک اجتماعی نمائندگی (Represntative) ہو اس نمائندگی کو ٹریڈ یونین کا نام دیا گیا یہ ٹریڈ یونین ایک سیاسی جماعت تھی جس کو سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کہتے تھے ۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو بعد میں حکومت میں شریک کیا جاتا اور اس سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی پوزیشن یہ تھی کہ وہ مزدوروں کے اجتماعی حقوق (Collective Rights) کا تحفظ کرے گی ۔ مزدوروں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ سرمایے کی بڑھوتری سے اپنا جائز حصہ حاصل کر سکے امید کی جاتی تھی کہ اس طریقے سے مزدوروں کو انقلابی عمل سے باز رکھا جا سکے گا اور اس طریقے سے مزدوروں کو سرمایے کے عمل کی توثیق پر راضی کیا جا سکے گا اس طرح سرمایے کی بڑھوتری سب کا مقصد عین بن جائے گی ۔ ان معنوں میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹیز میں اور پرانی پارٹیوں مثلاً کنزرویٹو پارٹی میں کوئی فرق نہیں تھا ۔ جتنی بھی Collective Bargaining ایجنٹ ہوتے تھے وہ سرمائے کی تقسیم سے متعلق ہوتے تھے نہ کہ سرمائے میں اضافہ کے جواز یا مقصد سے متعلق کیونکہ فروغ سرمایہ داری پر تو سب کا ایمان تھا ۔ Collective Bargaining اجتماعی سودا کاری سے مراد یہ ہے کہ لیبر کی یونین اور لیبر کی سیاسی پارٹی سرمایہ داروں سے مذاکرات کرتی تھی کہ آئندہ اجرتیں کیا ہوں گی ۔ مثلاً قیمتوں میں اضافہ اجرتوں کے اضافے کے ساتھ متناسب ہو وغیرہ ورکرز کو کچھ اجتماعی حقوق دیے جانے چاہئیں فیکٹری (Factory) کے اندر بھی اور باہر بھی ۔ یہ اجتماعی حقوق (Collective

(Rights) کا تصور Fordism کی بنیادی خصوصیت تھی ۔ اجتماعی حقوق کا تصور یعنی لیبر کو بحیثیت ایک کلاس کے ایسے حقوق دیئے جائیں جو سرمائے میں اضافے کو ممکن بنائے اور اس طرح وہ سرمایہ داری میں برابر حصہ دار ہو سکے برابری کی بنیاد پر معاہدہ (Equal Contract) کر سکے ۔ فورڈازم 1980ء تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹیاں حکومتوں میں شریک ہوتی رہیں اور ان حکومتوں کا مقصد یہی تھا کہ مزدوروں کو راضی رکھ سکیں تا کہ وہ سرمائے کی توثیق کے عمل کو معاشرتی عمل کے واحد، تنہا ہدف کے طور پر قبول کریں اور اس میں محض اپنا حصہ مانگیں اور کہیں کہ ہمیں اتنا حصہ دیا جائے۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کو ایک عادلانہ نظام کے طور پر ثابت کرنے کا یہ نہایت کامیاب طریقہ تھا۔

فورڈازم نے کمیونزم کو نابود کر دیا:

اس کے نتیجے میں کمیونزم مغربی دنیا میں تقریباً نیست و نابود ہو گیا ۔ جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تھی تو آپ جانتے ہیں کہ حالات ایسے تھے کہ فرانس میں، یونان میں اور کئی ممالک میں کمیونسٹ پارٹی کا حکومت میں آنا تقریباً لازمی نظر آتا تھا اس حکمت عملی پر عمل پیرا ہو کر اجتماعی سودے بازی (Collective Bargaining) کے عمل کی اداراتی صف بندی (Instutionalization) ممکن ہو سکی اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹیز کو حکومت میں شریک کر کے انقلاب کے اس خطرے سے جان چھڑا لی گئی ۔ اس کے نتیجے میں ایسا سرمایہ دارانہ نظام قائم ہوا جس میں مزدور، اس کی یونین اور اس کی سیاسی جماعت پوری طرح شریک ہو گئی۔ مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ یہ جو نئی اجتماعیت قائم کی گئی تھی لیبر کی اجتماعیت، یہ نہایت بودی اور کمزور ثابت ہوئی ۔ اجتماعیت سرمایہ داری کو سہارا دینے سے قاصر ثابت ہوئی اور مزدوروں کی اجتماعیت خود بخود تحلیل (disolve) ہونے لگی جیسے جیسے سرمائے کی بڑھوتری کا عمل بڑھتا گیا اور جیسے جیسے سرمائے کی بڑھوتری کا عمل عام ہوتا گیا اور جیسے جیسے سرمائے کی بڑھوتری کے عمل سے تمام افراد مستفید ہوتے گئے ویسے ویسے لیبر اجتماعیت کے قائم ہونے کا خطرہ بھی بتدریج ختم ہوتا گیا۔ لیبر کی اجتماعیت تو اس وقت تک قائم رہ سکتی تھی جب کہ فی الواقع سرمایہ کاری کے عمل میں ایک خاص عدم مساوات باقی رہے جس کے نتیجے میں عام آدمی، عام مزدور اس قابل ہی نہ ہو کہ اپنے آجر کے ساتھ معاملہ کر سکے جس وقت اجرتیں بڑھنے لگیں اور تعلیم کا معیار عام ہونے لگا اس وقت مزدوروں کے اندر خود اس نوعیت کی مسابقت پیدا ہونے لگی کہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹیز اور ٹریڈ یونینز فی

العمل معطل ہو کے رہ گئیں مثلاً 1970ء کے بعد سے تقریباً ہر یورپین ملک کی کیفیت یہ ہے کہ جو مجموعی تعداد مزدوروں کی ہے ان کا چالیس یا تیس فیصد حصہ بھی یونینز میں شریک نہیں ہوتا ۔سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے زیادہ ووٹ وہ کنزرویٹو پارٹی اور رائٹ ونگ کی پارٹی کو دیتے ہیں چنانچہ اجتماعی سودے بازی کا یہ عمل جو پہلے مزدوروں کا حصہ حاصل کرنے کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا غیر ضروری ہو گیا۔

۱۹۸۰ء میں پوسٹ فورڈازم کا نظام:

مزدور خود ان اجتماعیتوں یعنی یونینز اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹیز کی اجتماعیتوں سے برأت کا اعلان کرنے لگے چنانچہ 1980ء کے بعد سے جو نظام یورپ اور امریکہ میں قائم ہوا اسے پوسٹ فورڈ ازم (Post Fordism) کہتے ہیں۔اس پوسٹ فورڈازم کی تین چار خصوصیات میں سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ مزدوروں کی اجتماعیتیں پارہ پارہ ہو گئیں [Disorganization of Labour] مزدور جس طرح پہلے اپنی پارٹی یونینز کے ساتھ وفادار تھے وہ اب وفادار نہیں رہے وہ منتشر ہو گئے ۔دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس دور میں سرمایہ کا ارتکاز قومی سطح سے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر ہو گیا ۔دوسری جنگ عظیم کے بعد سے 1980ء تک کا جو دور ہے اس میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یورپی سرمایہ کوئی چیز نہیں تھا بلکہ ایک ایسی چیز تھی جسے ہم جرمن سرمایہ کہہ سکتے ہیں یا جسے ہم فرنچ سرمایہ کہہ سکتے ہیں، برطانوی سرمایہ کہہ سکتے ہیں ،امریکی سرمایہ کہہ سکتے ہیں ۔بین الاقوامی کمپنیاں [Multinational Companies] معیشت میں کم اہمیت رکھتی تھیں اور قومی کمپنیاں سرمایہ دارانہ معیشت کی روح رواں تھیں ۔عمومی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو سرمایہ داری 1980ء تک قائم رہی وہ قومی سرمایہ داری تھی ۔یعنی [National Capitalism] جس کے اندر بنیادی طور پر سرمایہ کا اپنی ترقی کے لیے تمام تر انحصار قومی ریاست پر تھا جب تک سرمایہ قومی یا ریاستی سطح پر ارتکاز کرتا تھا اس وقت تک قومی سطح پر مزدور طبقے کی اعانت کی شدید ضرورت تھی ۔

۱۹۸۰ء کے بعد سرمایہ قومی نہیں عالمی ہو گیا:

1980ء تک سرمایے کی ترسیل کے اوپر پابندیاں تھیں ،سرمائے کی ترسیل کو متعین کرنے کے لیے جو نظام قائم تھا اسے Bretenwood System کہتے تھے ۔ Bretenwood System میں ایک مرکزی ادارے کا تصور دیا گیا ۔یہ ادارہ IMF (انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ) تھا جو زر کی

قیمت متعین کرتا تھا۔یعنی ایک زر کی قیمت دوسرے زر کے مقابلے میں متعین کرتا تھااور زر کی ترسیل کے اوپر پابندیاں لگاتا۔اس طرح سرمائے کی ترسیل پر ریاست کا کنٹرول ہوتا تھا۔اس نظام کا مقصد مزدوروں کو سرمایے کے ساتھ ملا کر ایک ایسی قومی حکمت عملی بنانا جس کے نتیجے میں قومی سرمایہ کاری کی رفتار تیز سے تیز تر ہو۔لہٰذا مزدوروں کی اجتماعیت کی ضرورت اس وجہ سے بھی تھی کہ سرمایہ بنیادی طور پر قومی سطح پر مرتکز ہوتا تھا لیکن بین الاقوامی سطح پر مرتکز نہیں ہوتا تھا۔لیکن 1980ء کے بعد سے سرمایہ دارانہ نظام اور سرمایہ ریاست کی سطح سے بہت اوپر اٹھ گیا یعنی سرمائے کے ارتکاز کی سطح اب Global (عالمی) ہو چکی ہے آج امریکی سرمایہ داری، جاپانی سرمایہ داری، فرنچ سرمایہ داری مہمل چیز ہے سرمایہ تو عالمی ہے کوئی کمپنی بھی جاپانی، جرمن، امریکی کمپنی نہیں ہے۔ان معنوں میں وہ امریکی کمپنی نہیں ہے کہ آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ اس کے جو زیادہ تر شیئر ہولڈرز ہیں وہ امریکی ہیں یا جاپانی ہیں۔ان معنوں میں سرمایہ داری و سرمایہ کاری کے نظام میں بنیادی تبدیلی یہ آئی کہ سرمایہ کاری کا عمل ریاست سے اوپر اٹھ کر عالمی سطح پر ارتکاز حاصل کرنے لگا۔ظاہر ہے کہ مزدوروں کی جو تنظیمیں تھیں وہ اس طریقے سے ریاست کے اوپر نہیں اٹھائی جا سکیں جس طریقے سے سرمایہ کاری کی تنظیم ریاست کو پھلانگ گئی۔اس طریقے سے سرمایہ دارانہ سیاست بھی ریاست کو عبور نہ کر سکی۔

پوسٹ فورڈازم کی خصوصیات:

پوسٹ فورڈازم (Post Fordism) کی یہ خصوصیت اچھے طریقے سے سمجھ لیجیے کہ پوسٹ فورڈازم وہ دور ہے جب سرمایہ کاری عالمی Global سطح پر ہونے لگی۔یعنی سرمایہ عالمی سطح پر ارتکاز حاصل کرنے لگا۔اس کا تعلق قومی ریاست سے اور قومی مزدور یا غیر سرمایہ دارانہ قوتوں سے دوسری نوعیت کا ہو جاتا ہے اس کے اندر ریاست کو یا قومی اجتماعیتوں کو عبور کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ دوسری خصوصیت ہے پوسٹ فوڈازم کی۔تیسری خصوصیت یہ کہ اس کے نتیجے میں جس وقت سرمائے نے ریاست کو عبور کر لیا تو (امریکہ ایک استثناء ہے جس کو میں بعد میں بیان کروں گا یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں امریکہ کے معاملے میں اتنا صحیح نہیں ہے جتنا دوسری سرمایہ دارانہ ریاستوں اور سرمایہ دارانہ معاشرتوں کے بارے میں درست ہے۔اسی لیے امپریلزم پر گفتگو الگ تفصیل سے کی جائے گی۔پوسٹ فورڈازم کے عہد میں عام سرمایہ دار ریاست کمزور ہو گئی]امریکہ کمزور ریاست نہیں، نہایت طاقتور ریاست ہے۔

سرمائے نے اسے طاقتور بنایا ہے وہ کیوں اور کیسے اس کی تفصیل بعد میں بیان کی جائے گی]۔

سرمایہ دار ریاست ویلفیئر ریاست نہیں ہوتی:

پوسٹ فورڈازم کی عمومی خصوصیت یہ ہے کہ ریاست ایک کمزور ریاست ہوتی ہے اور کمزور ان معنوں میں ہوتی ہے کہ اس کا یہ بس نہیں چلتا کہ وہ سرمایے کو اپنے ارادے کا ماتحت کر سکے اس لئے ریاست کی یہ قوت کم ہوتی چلی جاتی ہے کہ سیاسی عمل کو معاشی عمل پر مسلط کر سکے۔ اس کے وسائل کم ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ مراعات جو اس نے مزدور طبقے کو دی تھیں وہ دینے کے قابل نہیں رہتی۔ چنانچہ عموماً موجودہ دور کی سرمایہ دارانہ ریاستیں ویلفیئر ریاستیں نہیں ہوتیں۔ ویلفیئر ریاست ہونے کی ضرورت بھی اس کے لیے اتنی نہیں رہتی جتنی پہلے تھی اور اس کے اندر وہ قوت بھی نہیں ہوتی کہ وہ ویلفیئر ریاست رہے اس کی تفصیلات میں فی الحال عرض نہیں کر سکتا۔ اور شاید پورے طور پر عرض نہ کر پاؤں۔ ویلفیئر ریاست کا قیام آج سرمایہ دارانہ نظام میں ممکن نہیں ہے اور وہ لوگ جو اس قسم کی بات کرتے ہیں کہ ویلفیئر ریاست قائم ہو دراصل سرمایہ داری کو جانتے ہی نہیں ہیں یہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء سے پہلے کے دور میں جو سرمایہ داری ویلفیئر تھی اسی کا کوئی کلاسک ماڈل سمجھتے ہیں۔ اصل میں انہیں پتہ ہی نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ویلفیئر ریاست کی تمام گفتگو مہمل گفتگو ہے۔ اور بالخصوص اسلامی ویلفیئر ریاست کے نظریے کے مبلغ لوگ میری رائے میں ویلفیئر ریاست کو بالکل نہیں جانتے۔ اسلامی ویلفیئر تو ظاہر ہے میری رائے میں ممکن ہی نہیں۔ ویلفیئر ازم کیا ہے اس کی تفصیل جب واضح ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ ریاست سے اوپر اٹھ جاتا ہے جبکہ سیاسی تنظیم یعنی سیاسی صف بندی ریاستی سطح سے اوپر نہیں اٹھ پاتی۔ پوسٹ فورڈازم نظام میں ریاستی کمزوری کا اظہار دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ اول یہ کہ سرمائے کی ترسیل کے اوپر پہلے جتنی حدبندیاں قائم کی گئی تھیں وہ بتدریج ختم کر دی جاتی ہیں مثلاً Bretnowood System بالکل ختم ہو گیا اور IMF کا وہ کردار بالکل نہیں رہا۔ اس وقت IMF زرمبادلہ کو متعین کرنے میں سرے سے کوئی کردار ادا نہیں کرتا اور سرمایہ دارانہ ممالک میں پیسے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر سرے سے کوئی پابندی نہیں۔ چنانچہ سرمائے پر جتنی تحدید پہلے قائم کی گئی تھی وہ تقریباً سب ختم ہو چکی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فی الواقع سرمایہ دارانہ ریاست سرمائے کے ماتحت ہو گئی۔ سرمایہ نہایت سیال ہو جاتا ہے۔ سیال ان معنوں میں کہ سرمایہ ایک جگہ سے دوسری جگہ نہایت آسانی سے منتقل ہوتا رہتا ہے۔

منٹوں سیکنڈوں میں سرمایہ ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں چلا جاتا ہے۔سرمایہ اپنی بڑھوتری کے تمام ذرائع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے معاملے میں خودمختار ہو جاتا ہے اور ریاست کی سطح سے اوپر اٹھ جاتا ہے اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ریاست کو عبور کر سکے۔ریاست کو ماتحت اور زیر کر سکے اس کا ایک اظہار تو اس چیز میں ہوتا ہے کہ ریاست خود سرمائے کی باج گزار ہو جاتی ہے۔دوم یہ کہ براہِ راست یا بلاواسطہ مزدور کو سرمائے کے ماتحت کر دیا جاتا ہے اور اجتماعی سودے بازی (Collective Bargaining) کی صلاحیت کی جگہ جو چیز لیتی ہے اس کو کہتے ہیں Total Quality Management یا Human Resource Management۔ہر کمپنی خود اپنے مزدوروں کو منظم کرتی ہے جس طریقے سے وہ سرمائے کو منظم کرتی ہے۔مزدور بذاتِ خود سرمایہ بن جاتا ہے اسے آپ کہتے ہیں انسانی سرمایہ (Human Capital) انسانی سرمائے کا کیا مطلب ہے؟ مطلب یہ کہ ہم کسی بھی انسانیت کا اقرار نہیں کرتے۔ہر چیز سرمایہ ہے۔مشین بھی سرمایہ ہے زمین بھی سرمایہ ہے مزدور بھی سرمایہ ہے۔

HRM سرمایہ داری کو مستحکم کرنے کی حکمت عملی:

سرمایہ داری کو وسعت اور استحکام عطا کرنے کے لیے total Quality Management(TQM) اور Human Resource Mangement (HRM) جیسے نام نہاد نئے علوم ایجاد کیے گئے ہیں ان کا مقصد (Collectivity) اس اجتماعیت کو ختم کرنا ہے جس کی بنیاد پر سرمایہ اور محنت اس بات کا تعین کرتے تھے کہ کس طریقے سے حصہ بانٹا جائے۔ Human Resource Management اور TQM وہ ذریعہ ہے جس سے ہم سرمائے کے اندر محنت کو ضم کر دیتے ہیں اور ہر شخص سے کہتے ہیں کہ تمہارا ذاتی فائدہ اسی میں ہے کہ تم بھی سرمائے کی بڑھوتری میں اسی طریقے سے اپنی ذات کو مدغم کر دو جس طریقے سے Manager اپنی ذات کو مدغم کرتا ہے۔سرمائے کا مالک اپنی ذات کو مدغم کرتا ہے۔مزدور اور مینیجرز کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں رہتا۔دونوں سرمائے کے یکساں خادم ہوتے ہیں کسی اجتماعی حق Collective Right کی ضرورت نہیں رہتی۔

عیسائیت،قوم پرستی اور مزدوروں کی اجتماعیتوں کا خاتمہ:

سرمایہ داری خود اجتماعیت بن چکی ہے:

سرمایہ دارانہ نظام میں اجتماعیت Collectivity کا باقی رہنا ممکن ہی نہیں رہتا۔سرمائے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ مسابقت کو فروغ دیتا ہے۔مسابقت کس میں ہوتی ہے۔افراد میں ہوتی ہے آخرکار سرمایہ داری نے عیسائیت کو ختم کر دیا۔سرمایہ داری نے قوم پرستی کو ختم کر دیا۔تو سرمایہ داری مزدور طبقے کی اجتماعیت Collectivity کو کیسے قائم رکھ سکتی تھی۔ہاں یہ بات درست ہے کہ سرمایہ داری کو اس سطح پہ پہنچانے کے لیے جہاں وہ ہر اجتماعیت کو ختم کر دے اس بات کی ضرورت تھی کہ خود ایک سرمایہ دارانہ اجتماعیت بنائی جائے اس لیے کہ پہلے جو عام آدمی تھا اپنے آپ کو مزدور تو نہیں سمجھتا تھا وہ اپنے آپ کو عیسائی سمجھتا تھا اپنے آپ کو جرمن سمجھتا تھا کچھ اور سمجھتا تھا وہ سرمایہ دارانہ نظام کا کوئی عمل اگر اس کی اس حیثیت سے متصادم ہوتا تھا کہ وہ ایک جرمن ہے۔ایک عیسائی ہے تو وہ سرمایہ دارانہ نظام کی مزاحمت کرتا تھا۔اس مذہبی وقومی مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے ایک ایسی اجتماعیت collectivity پیدا کی گئی جس کے نتیجے میں ہر آدمی کی وفاداری (Loyality) قوم کے ساتھ یا مذہب کے ساتھ رہنے کے بجائے سرمایے کے ساتھ ہو جائے اس لیے یہ اجتماعیت (Collectivity) پیدا کرنا سرمایے کی ایک ضرورت تھی لیکن اب وہ اس ضرورت سے بھی پیچھا چھڑا چکا ہے۔

اجتماعی حقوق کی جگہ حقوق انسانی:

سرمایہ دارانہ نظام کو ایک ایسی اجتماعیت(Collectivity) کی ضرورت تھی جو سرمائے کے فروغ کو بھی ممکن بنائے اور اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری سے متصادم تمام اجتماعیتوں کو ختم کرے لیکن Post-Fordism میں مزدور طبقے کی اجتماعیت بھی سرمایہ داری کے لیے نا قابل برداشت ہو چکی ہے لہٰذا اس کا انہدام بھی سرمائے کے عمومی تحفظ کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے Post-Fordism میں اجتماعی حقوق Collective Rights کی بجائے حقوقِ انسانی (Human Rights) کی جدو جہد ضروری سمجھی گئی۔Human Rights کا فروغ سرمایہ داری کے عمومی تحفظ کی ضمانت ہے لہٰذا Human Rights کی اصلیت کو سمجھنا ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔

انسانی حقوق سرمایہ کی بڑھوتری کا ذریعہ ہیں:

Human Rights محض سرمایے کی بڑھوتری کو ممکن بنانے کے ذرائع ہیں۔ جیسے کسی نے کہا Human Rights are the observers of the duty to accumulate the capital. سرمایہ دارانہ معاشرے میں فرض کیا ہے؟۔ سرمایے کی بڑھوتری۔ یہ فرض ہے۔اس فرض کو ادا کرنے کے لیے کچھ حقوق دیے گئے ہیں بالکل جس طریقے سے اللہ تعالیٰ اگر ہمیں ارادہ عطانہ کرتے تو ہم نماز ادا نہیں کر سکتے تھے یا فرض کریں جانوروں کی طرح ہم ہوتے تو ہمارے لیے نماز ممکن نہیں تھی۔اسی طریقے سے سرمائے کی بڑھوتری کو ممکن بنانے کے لیے بھی کچھ ذرائع کی ضرورت تھی Human Rights وہ ذرائع ہیں جو انسان کو یکسو کر دیتے ہیں اس بات پر کہ زندگی کا مقصد صرف سرمائے کی بڑھوتری ہے۔ Post-Fordism کا بنیادی وظیفہ یا Post-Fordism کی بنیادی ایمانیات بنیادی حقوق Human Rights ہیں جس چیز کو وہ فروغ دینا چاہتی ہے وہ Human Rights ہیں۔جس وقت کسی معاشرے میں Human Rights عام ہو جائیں تو ہر شخص اس بات پر مطمئن ہو جائے گا کہ اجتماعیت collectivity کوئی فیصلہ بھی کیوں نہ کرے وہ تو بحیثیت ایک فرد کے اپنے آپ کو سرمائے کی بڑھوتری کی نذر کر چکا ہے اور Human Rights وہی Rights ہیں جن کے ذریعے سرمائے کی بڑھوتری کو ممکن بنایا جاتا ہے۔اگر Human Rights ایک سوسائٹی میں موجود نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ وہ سرمائے کی بڑھوتری کے قابل نہیں رہتی۔Human Rights وہ حقوق ہیں یا Human Rights وہ ذرائع ہیں جو اس فرضیت کی ادائیگی کو ممکن بناتے ہیں جسے ہم سرمائے کی بڑھوتری کہتے ہیں۔چنانچہ Post-Fordism سوسائٹی میں اجتماعی حقوق collective Rights کی جگہ بنیادی حقوق Human Rights لے لیتے ہیں۔

بنیادی حقوق ایک خاص تاریخ کی تخلیق ہیں:

جس کا مقصد محض سرمائے کی بڑھوتری ہے۔

کسی بھی تصور (Concept) کو تاریخ سے صرفِ نظر کر کے اس کی مجرد حیثیت میں لے لینا نہایت خطرناک بات ہے۔بنیادی حقوق Human Rights کی تاریخ سے واقف ہوئے بغیر

Human Rights کے اوپر کچھ کہنا یا لکھنا یا ہیومن رائٹس کی دوسری تعبیر پیش کرنا یہ ہیومن رائٹس کی حقیقت اور اصلیت سے دانستہ صرف نظر کرنا ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم مغربی اصطلاحات کی تاریخ اور فلسفے سے واقفیت کے بغیر ان اصطلاحات کے غلط اردو تراجم کی بنیاد پر مغرب کا اسلامی محاکمہ کرتے ہیں۔ ہیومن رائٹس کی آپ کوئی بھی تعریف بیان کریں تاریخ میں ہیومن رائٹس وہی ہیں جو مغرب نے قائم کیے اور ہیومن رائٹس وہی ہیں جو ہر فرد کو سرمایے کی بڑھوتری کو ممکن بنانے کے وسائل فراہم کرنے کے لئے عطا کئے گئے ۔اگر ہیومن رائٹس کے لئے وسائل موجود نہ ہوں تو سرمائے کی بڑھوتری ممکن نہیں ہو سکتی اسی لیے کسی بھی ایسے تصور کو جو غیر اسلامی تاریخ سے نکلا ہے اسلامی جامہ پہنانے کی کوشش ایک نہایت خطرناک بات ہے ۔اس کا فلسفہ اور اس کے اعتقادات دوسرے ہیں لہٰذا اسلامی جمہوریت، اسلامی انسانی حقوق، اسلامی ویلفیئر اسٹیٹ یہ تمام چیزیں دراصل اسلام کو مغربی تہذیب میں ضم کرنے کے ذرائع ہیں اور اسلام کی انفرادیت کو مجروح کرنے کا باعث بن سکتے ہیں ۔ایسا کرنے والوں کی نیت اور اخلاص میں کوئی شک کرنا درست نہیں مگر اس کا سبب محض لاعلمی ہے لہٰذا ان اہم معاملات کی طرف علماء کرام اور صوفیائے عظام کو خاص طور پر متوجہ کرنا چاہیے کہ مغربی تاریخ سے اور بالخصوص مغربی Intelectual History سے مغربی فکری تاریخ سے خوب اچھی طرح واقف ہوں تا کہ مغربی فلسفے کی اسلام کاری کی کوشش کو نا ممکن بنایا جا سکے ۔انسانی حقوق کے حوالے سے عالم اسلام کو زبردست خطرہ درپیش ہے ۔انسانی حقوق کو اسلامی جواز فراہم کیا جا رہا ہے ۔انسانی حقوق کی تاریخی حقیقت اور انسانی حقوق کی تاریخی حیثیت سے واقف ہوئے بغیر اس خطرے کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ۔یہ بات اچھے طریقے سے سمجھ لینا چاہیے۔ کہ اس وقت سرمایہ داری کی مزاحمت مغرب میں اس وجہ سے کمزور نہیں پڑی کہ یہ کوئی Technological ضرورت ہے یعنی سرمایہ کی بالا دستی اور عالمگیریت کی کوئی دوسری اجتماعیت (Collectivity) بالخصوص مزدوروں کی اجتماعیت (Collectivity) نہیں کر سکتی اس کی کوئی ٹیکنالوجیکل بنیاد نہیں حقیقت تو یہ ہے کہ نئی ٹیکنالوجی کارکنوں کے شعبے کو نیا وہ طاقتور بنا دیتی ہے اور ایک شعبہ کو دوسرے شعبے کے مقابلے میں کھڑا کرتی ہے اس ٹیکنالوجی کے نتیجے میں یہ نہیں ہوتا کہ قوت مزدوروں سے نکل کر مینجرز کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ایک کارکنوں کے ایک گروہ کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے گروپ آف ورکرز کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے لیکن دوسرا گروپ اپنے آپ کو انتظامیہ کا حصہ سمجھتا

ہے اور جس وجہ سے اس وقت سرمایہ داری کی مزاحمت (Resistance) مغربی دنیا میں موجود نہیں ہے اور جس وجہ سے سوشل ڈیموکریٹک جماعتیں کنزرویٹو جماعتوں کے پروگرام ہی پیش کررہی ہیں۔

پوسٹ فورڈازم کا مذہب انسانی حقوق اور سرمایہ کی غلامی:

اس طرز عمل کے باعث مغرب بالخصوص یورپ میں مزدوروں کی اجتماعیت (Collectivity)، نہ صرف منتشر ہوگئی ہے بلکہ ختم ہوگئی ہے اور مزدور اس بات پر راضی ہوگئے ہیں کہ وہ Human Rights کو براہ راست حاصل کرسکیں، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ Fordism اور Post-Fordism میں بنیادی طور پر اعتقادی فرق موجود ہے۔ اعتقادی فرق سے مراد یہ ہے کہ پہلے مزدور طبقہ یہ سمجھتا تھا کہ Collective Rights کے بغیر وہ سرمایہ کاری کے عمل سے پورے کے پورے طور پر مستفید نہیں ہوسکتا Post-Fordism دور میں مزدور طبقہ اپنے آپ کو بحیثیت ایک اجتماعیت کے تسلیم نہیں کرتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ Human Rights کا طریقہ کار Discourse ہی عالمی طریقہ کار یونیورسل discourse ہے ہر آدمی سرمایہ دارانہ معاشرے کا حصہ ہے اور ہر آدمی کی زندگی کا مقصد سرمائے کی بڑھوتری اور فروغ ہے اور ہر آدمی اگر صحیح جدوجہد اور جستجو کرے گا تو اس کو سرمائے کی بڑھوتری کا فائدہ پہنچے گا یہ چیز Human Rights کو ممکن بناتی ہے۔ Fordism سے Post-Fordism میں تبدیلی کسی ٹیکنیکی بنیاد پر نہیں ہوئی بلکہ یہ عمل اعتقادی تبدیلی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ سرمایہ داری کی اس کامیابی کے باعث سرمایے نے ہر آدمی کو براہ راست سرمایہ کاری کے عمل میں شریک کردیا ہر شخص سرمایے کا خادم ہے اور موجودہ Post-Fordism کے نظم سرمایہ داری میں طبقات موجود نہیں، کوئی سرمایہ دار نہیں، کوئی مزدور نہیں، ہر شخص سرمایے کا خادم ہے، غلام ہے، سرمایہ کی خدمت ہی اصل بندگی ہے اور ہیومن رائٹس اس کا مذہب ہے۔

مغرب میں مذہب کی جگہ انسانی حقوق نے لے لی:

سرمایہ کی پرستش اصل مذہب ہے:

سرمایہ دارانہ معاشرے میں مذہب کی جگہ جس چیز نے لی ہے وہ ہیومن رائٹس ہیں۔ ہیومن رائٹس پر سب کا اعتقاد ہے اور سب اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر کسی طریقے سے فلاح حاصل کرنا ہے تو سرمائے کی بڑھوتری میں حصہ لینا ہے لہٰذا کسی نہ کسی طریقے سے سرمائے کی بڑھوتری کے عمل میں شریک

ہوں ۔ان معنوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو عمل سترہویں صدی میں جب یورپ کے اندر خدا کا بندہ (Subject of God) تھا ۔خدا کا بندہ سرمائے کے بندے میں تبدیل ہو گیا ۔ (Subject of God has been transformed into subject of capital. Subject of God has become the subject of Capital.) یہ پورا عمل Post-Fordism کی وجہ سے ممکن ہو سکا ۔Post-Fordism کے باعث مغربی تہذیب میں اب ایک عام آدمی کی حیثیت Subjectivity سرمایہ خود متعین determine کرتا ہے ۔مغرب کا آدمی پہلے خدا کی پرستش کرتا تھا اس کے بعد وہ قوم کی پرستش کرتا تھا اب وہ نہ خدا کی پرستش کرتا ہے نہ قوم کی پرستش کرتا ہے وہ سرمائے کی پرستش کرتا ہے ۔مختصر طور پر اس پورے تاریخی عمل کو ہم بیان کریں تو تین جملوں میں اسے سمویا جا سکتا ہے کہ

"Subject of God has been transformed into the subject through the displacement of christanity by collective rights and through the displacement of collective rights by human rights."

اصل رب ،حق ،خیر صرف سرمایہ ہے:

سرمایہ داری نے پہلے عیسائی تصور خیر و حق کو اجتماعی تصور خیر اور اجتماعی تصور حق سے تبدیل کیا یہ عمل سوشلزم اور سوشل ڈیموکریسی نے کیا اور اس کے بعد اجتماعی تصور حق کو انسانی حقوق Human Rights کے ذریعے تصور حق میں تبدیل کیا گیا اور یہ کام Post-Fordism کے اندر ممکن ہوا ۔یہ جو اجتماعیتوں (Collectivities) کا اختتام ہے یہ خود سرمائے کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے ۔اس لیے کہ جب معاشرے کو اس طریقے سے آپ منتشر کر دیتے ہیں کہ معاشرے میں خاندان برادری ،قبیلہ، مذہب کی بنیاد پر صدیوں سے قائم اجتماعیتیں ریزہ ریزہ کر دی جائیں اور ہر شخص کو تنہا کر کے سرمایے کا خادم بنا دیا جائے تو سیاسی عمل مہمل ہو جاتا ہے اس لیے کہ اگر ہم سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ زندگی کا اکیلا کام سرمائے کی خدمت ہے تو یہ محض تکنیکی کام رہ جاتا ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ سرمائے کی خدمت کس طریقے سے کی جائے سیاسی اختلاف کی گنجائش سرے سے ختم ہو جاتی ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ سرمایہ

دارانہ نظام نے اپنی جو توجیہہ بیان کی ہے وہ آزادی ہی کے تناظر میں بیان کی ہے جس کے نتیجے میں انسان سرمایہ کا بندہ حق اور خیر سرمایہ [Capital] کے مترادف بن جاتے ہیں۔چنانچہ سیاسی اختلاف کا ختم ہوجانا جمہوریت کے ختم ہوجانے کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوریت کے بارے میں کوئی ولولہ (Enthusias) اس وقت سرمایہ دارانہ معاشروں میں تقریباً ناممکن ہوکر رہ گیا ہے۔امریکہ کے گزشتہ صدارتی انتخابات میں پچاس فی صد سے کم رائے دہندگان نے حصہ لیا۔دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے۔(یعنی نکسن کے انتخابات کے بعد سے) جمہوریت سے برأت کا عمل پورے مغرب میں عام ہے۔اسے کہتے ہیں شہریت سے علیحدگی کا عمل (Withdrawal from Citizenship)۔

کیا ویلفیئر اسٹیٹ کا قیام ممکن ہے:

مغربی معاشروں میں زندگی کے بے معنی ہونے کا تصور اس سیاسی بے زاری اور سیاسی عمل سے لاتعلقی کا ایک اظہار بھی ہے۔یہاں تو صرف اس بات کا ادراک کرنا ہے کہ یہ جو اجتماعیتوں کا ختم ہوجانا Post-Fordism کی بنیادی کمزوری ہے۔اور اس بنیادی کمزوری سے اس طریقے سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا کہ انہی اجتماعیتوں [Collectives] کو دوبارہ قائم کیا جائے جن کو Post-Fordism نے ختم کیا ہے جو لوگ جمہوریت کو ذریعہ تبدیلی سمجھتے ہیں بنیادی طور پر Collective Rights کی بنیاد پر وہ اجتماعیتوں کو قائم کرنا چاہتے ہیں جن کو سرمایہ داری نے خود ختم کیا ہے جس اجتماعیت کو ہمیں قائم کرنا ہے وہ اجتماعیت وہ ہے جو سرمایہ دارانہ حقوق کا انکار کرے چاہے وہ collective Rights ہوں چاہے وہ Human Rights ہوں۔سرمایہ داری کا انکار اور سرمایہ دارانہ حقوق کا انکار ایک ہی چیز کے دو نام ہیں تو اگر فی الواقع Post-Fordism دور میں سرمایہ دارانہ نظام کو Transcend کرنا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام کو عبور کرنا ہے تو ایک ایسی اجتماعیت کو قائم کرنا ہوگا جو سرمایہ دارانہ حقوق کو رد کرے۔اس کے برعکس اگر آپ ویلفیئر رائٹس کی بنیاد پر سرمایہ دارنہ نظام کو قائم کریں گے تو آپ صرف ویلفیئر اسٹیٹ قائم کرکے Post-Fordism سے Fordism کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کریں گے جو فی العمل ناممکن ہے۔سرمایے کے بین الاقوامی ارتکاز کے باعث جس Transition کی کوشش کررہے ہیں وہ سرے سے ممکن ہی نہیں۔اگر فرض کیجیے ممکن ہو بھی جائے تو

وہ سرمایہ داری کی ہی تجدید ہے، سرمایہ داری کا ہی احیاء ہے اگر فی الواقع آپ اجتماعی حقوق کی بنیاد پر ایک نئی اجتماعیت Collectivity کے قیام کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں کامیاب ہوتے ہیں تب بھی وہ محض سرمایہ داری کا احیاء ہے لہٰذا سرمایہ داری کو عبور کرنا اور سرمایے کی بڑھوتری کو مقصد حیات کے طور پر رد کرنا ہے تو آپ کو لازماً ایک ایسی اجتماعیت پیدا کرنا ہے جو سرمایہ داری کو رد کرے اور سرمایہ دارانہ حقوق کو رد کرے۔ظاہر ہے ہمارے اور آپ کے ملک میں وہ اکیلی اجتماعیت اسلام کی اجتماعیت ہے جس کے اندر سرمائے کی بڑھوتری کو زندگی کا مقصد بنانے کا سرے سے کوئی تصور موجود نہیں ہے۔مجھ جیسے جاہل اور بے عمل آدمی کو تو یہی معلوم ہے کہ ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں سرمائے کی عبادت نہیں کرتے اور سرمائے کی عبادت کو خدا کی عبادت کا ذریعہ بھی نہیں سمجھتے، میں تو یہی سمجھا ہوں۔ہر وہ عمل جس کے نتیجے میں سرمائے کی عبادت کو جائز کیا جاتا ہے وہ دراصل اسلام کو کمزور کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

دوسرا باب

سرمایہ دارانہ شخصیت کے اجزائے ترکیبی

مغرب اور اسلام کا تصور خیر اور حق

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

اس باب میں اختصار کے ساتھ مغربی مفکرین کے حوالے سے اس تصور حق (Right) اور تصور خیر (Good) کی وضاحت پیش کروں گا جس تصور حق اور تصور خیر پر سرمایہ داری اور جمہوریت قائم ہیں۔

میں ان مفکرین کے اساسی تصورات اور فکر پیش کروں گا اس جائزے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اسلام کے تصور حق و خیر اور مغرب کے تصور حق و خیر میں کسی قسم کی کوئی مماثلت نہیں ہے اور دونوں نظام ہائے حق و خیر ایک دوسرے کی ضد ہیں لہٰذا ان دونوں کے مابین کسی قسم کا مکالمہ ممکن نہیں ہے۔

اس وقت کرنے کا کام یہی ہے کہ ان مغربی مفکرین اور فلاسفہ کا اسلامی محاکمہ پیش کریں جن کے نظریات پر مغربی تہذیب اس کا فلسفہ اور اس کی پوری عمارت کھڑی ہوئی ہے۔لہٰذا علماء اور طالب علموں کی توجہ کے لیے چند عمومی باتیں بڑے بڑے مغربی مفکرین اور فلاسفہ کے حوالے سے مختصراً پیش کی جا رہی ہیں۔

کسی بھی نظام فکر میں سب سے بنیادی مسئلہ تصور ذات یعنی Self کا مسئلہ ہے۔میں مغرب کی اصطلاحات ہی استعمال کروں گا۔Self کو Self ہی کہوں گا ذات نہیں کہوں گا اور دوسرے تصورات بھی انہی کی اصطلاح میں بیان کروں گا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً مجھے ان کا ترجمہ معلوم نہیں، دوسرے یہ کہ تصورات (Concepts) کا ترجمہ پیش کرنا ایک نہایت مشکل کام ہے۔مثلاً حیا کا کوئی انگریزی ترجمہ نہیں کیا جا سکتا یا غیرت کا کوئی ترجمہ انگریزی میں نہیں کیا جا سکتا۔انہی معنوں میں سمجھتا ہوں کہ Self کا کوئی ترجمہ ممکن نہیں۔جیسے Ontology۔اس کا کوئی ترجمہ ہمارے ہاں بہت مشکل ہے۔یہ علمائے کرام ہی کا کام ہے کہ ان مغربی تصورات کا اسلامی محاکمہ کریں اور اسلامی علوم میں ان کی کیا حیثیت ہے،اسے واضح کریں۔

گفتگو کا محور بیسویں صدی کا فلسفہ ہے۔لیکن بیسویں صدی کے فلسفہ میں تصور فرد

(Theory of Self) یا تصور ذات کو سمجھنے کے لیے چند اجمالی باتیں اٹھارویں اورانیسویں صدی کے نمایاں فلسفیوں کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں مغرب میں کوئی صف اول کا مابعد الطبیعیات دان (Metaphysician) پیدا نہیں ہوا ہے۔یا کم از کم میری ناقص رائے میں ایسا ہی ہے۔مغرب فکری (Intellectually) طور پر بانجھ ہے۔بالخصوص الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کے دائرے میں بیسویں صدی میں مغرب میں کوئی بنیادی کام نہیں ہوا ہے۔بنیادی طور پر اٹھارویں صدی اورانیسویں صدی کے مفکرین کے کام پر نئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔یہ بات مابعد الطبیعیات اوراخلاقیات دونوں شعبوں کے بارے میں بلاخوف کہی جا سکتی ہے۔

اٹھارویں صدی میں جس فکر نے عیسائیت کو شکست دی اس کی دو شاخیں تھیں۔

۱۔تحریک تنویر (Enlightenment) ۲۔تحریک رومانویت (Romanticism)

یہ دونوں تحریکیں مغربی تہذیب کی روح رواں ہیں۔مغربی تہذیب کے بنیادی آدرش انہی تحریکوں سے حاصل ہوتے ہیں اور مغربی تہذیب کے بنیادی تصورات،عقائد وافکار ونظریات فی الحقیقت تحریک تنویر اور تحریک رومانویت ہی سے نکلے ہیں۔

تحریک تنویر کی علمیات:

یہ دونوں تحریکیں بنیادی طور پر وحی کا انکار کرتی ہیں۔انہی معنوں میں یہ عیسائیت کا بھی انکار ہیں۔پروٹسٹنٹ (Protestanism) عیسائیت نے اس انکار کا اولین جواز فراہم کیا تھا۔پروٹسٹنٹ ازم کا بانی لوتھر کفر کے غلبہ کے سلسلہ میں اصل مجرم ہے۔عقل انسانی کو وحی کی تعبیر اور تفسیر کا واحد ذریعہ قرار دے کر اور اجماع کی حجیت کو رد کر کے اس نے انکار وحی کی تحریکوں کے لیے زمین ہموار کی۔اس نے عیسائی تناظر میں وحی کے انکار کی عمومی قبولیت کے لیے بنیادیں فراہم کیں۔وحی کے انکار سے مراد کیا ہے ؟ وحی کے انکار سے مراد یہ ہے کہ عقل استقرائی (Inductive Reason) اور عقل استخراجی (Deductive Reason) کو استعمال کر کے حقیقت (Ontology) تک رسائی ہو سکتی ہے۔عقل وحی اور علم لدنی کے بغیر ان سوالات کا جواب دے سکتی ہے کہ انسان کیا ہے؟ انسان کی کائنات میں حیثیت کیا ہے ؟ وغیرہ یہ Ontological سوالات ہیں۔عیسائیت یہ کہتی تھی کہ ان Ontological سوالات کا جواب وحی کے بغیر نہیں دیا جا سکتا۔اسلام بھی یہی کہتا ہے لیکن تحریک تنویر اس بات کی داعی ہے کہ ان سوالات کا شافی وکافی جواب عقل انسانی کے ذریعہ مل سکتا ہے اس کے لیے کسی ماورائی ذریعہ علم کی ضرورت نہیں ہے۔جس طریقہ سے عقل کو استعمال کرتے ہوئے ریاضی اور منطق کے مسائل حل کیے جا سکتے ہیں اسی طریقہ سے عقل کو استعمال کر کے مابعد الطبیعاتی حقائق اور حقیقت انسان و کائنات کے بارے میں مسائل بھی حل کیے جا سکتے ہیں۔

بنیادی ذریعہ علم عقل ہے:

یہ تحریک تنویر کی علمیات (Epistemology) ہے۔اس علمیات کے مطابق اس قسم کے

سوالات کہ تم کون ہو؟ تم کہاں سے آئے ہو؟ تم کہاں جاؤ گے؟ تمھیں کیا کرنا ہے؟ کائنات کی حیثیت کیا ہے؟ تخلیق کے عمل کی حیثیت کیا ہے وغیرہ۔ ان سب سوالات کے جوابات عقل استقرائی اور عقل استخراجی کی مدد سے دیئے جاسکتے ہیں۔

تحریک رومانویت کی علمیات:

تحریک تنویر کے برعکس تحریک رومانویت (Romanticism) یہ قرار دیتی ہے کہ حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ عقل استقرائی اور عقل استخراجی نہیں ہے بلکہ وجدان (Intution) ہے۔ Intuition لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب "دیکھنا" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تحریک تنویر کے برعکس تحریک رومانویت کے نزدیک حقیقت کو براہِ راست "دیکھا" جاسکتا ہے اور اس براہِ راست دیکھنے کے ذرائع انسانی جبلتیں، انسانی خواہشات اور احساسات ہیں، یہی وجدان ہے اور کچھ نہیں ہے۔ عقل استقرائی اور عقل استخراجی انسانی جبلتوں، خواہشات اور احساسات کی آلۂ کار (Instrument) ہیں۔ تحریک رومانویت نے تحریک تنویر کے برعکس انسانی جبلتوں، خواہشات و احساسات کو بنیادی ذریعہ علم تصور کیا ہے۔

بنیادی ذریعہ علم وجدان ہے:

غرض تحریک رومانویت کے مطابق بنیادی ذریعہ علم Intuition ہے اور عقل خواہشات کی نوکر ہے (Reason is the Slave of Desire) جیسا کہ بینتھم (Bentham) کہتا ہے (گو کہ وہ رومانوی نہیں تھا) کہ عقل تو دراصل خواہشات کی غلام ہے، وہ تو دراصل Intuition کی باندی ہے اور اصل میں حقیقت تک رسائی کا ذریعہ (Intuition) ہے۔ خود انسان کے اندر وہ جبلتیں ہیں جن کے ذریعہ وہ Ontological Reality تک پہنچ سکتا ہے۔

روسو کے ذریعے تحریک تنویر اور تحریک رومانویت کا ادغام:

سیاسی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے اس دوسرے فلسفہ کا سب سے زیادہ اثر ہوا۔ جس شخص نے تحریک تنویر کو اور تحریک رومانویت کو باہم ملا دیا وہ روسو تھا۔ روسو کے ہاں ایک بڑا بنیادی تصور ارادۂ عمومی (General Will) کا ہے۔ روسو کے خیال میں انسان بنیادی طور پر خیر ہے اور ہمیشہ خیر کا طالب ہوتا ہے۔ انسانی خواہشات، جبلتیں، احساسات فطرتاً پاک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے ارادے کے تحت جس چیز کو پسند کرتا ہے وہ عمومی فلاح ہے۔

انسان خود بخود، بغیر کسی وحی کے، بغیر کسی رہنمائی، بغیر کسی نظام اطاعت کے، بذات خود اس چیز کا مکلف ہے کہ وہ ارادۂ عمومی کے ذریعہ خیر کا تمنائی ہو۔ ہر فرد کا ارادہ، ارادۂ عمومی کا اظہار اس لیے ہے کہ ہر فرد بنیادی طور پر خیر ہے۔ یہی خیال ارادۂ عمومی کا یہی تصور جمہوریت اور سرمایہ داری کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جمہوریت اور سرمایہ داری کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ "General Will always wills human welfare"

(۳۷)سینتیس

''ارادہ عمومی ہمیشہ انسانی فلاح کا ارادہ کرتا ہے''

مقصد یہ ہے کہ انسان کا عمومی ارادہ خیر ہے۔ وہ اس بات پر مجبور بھی ہے اور تمنائی بھی ہے کہ وہ جس چیز کا ارادہ کرے وہ ایسی ہو جس سے سب لوگوں کی بھلائی اور فلاح ہو۔ ارادۂ عمومی فی نفسہ خیر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فی نفسہ خیر ہے۔

"The Self is essentially good"

''انسانی ذات فی نفسہ خیر ہے''(ترجمہ)

انسانی Self فی الواقع خیر کا ادراک کرتا ہے اور ارادہ بھی خیر کا کرتا ہے۔ تحریک رومانویت کے نزدیک انسانی نفس بنیادی طور پر خیر کا منبع ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خیر کے ادراک اور خیر پر عمل پیرا ہونے کے لیے وحی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

انسان اور خدا میں کوئی فرق نہیں:

تحریک تنویر میں تو شروع ہی سے یہ تصور موجود ہے کہ انسان اور خدا میں دراصل بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ اس خیال کو مختلف سطحوں پر مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ سارتر کے افکار میں یہ بات واضح ہے۔ عموماً بیسویں صدی میں یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے لیکن شروع سے ہی یہ خیال کہ انسان علم و عمل، معاشرت و سیاست کسی شعبہ میں بھی دوسرے کا محتاج نہیں ہے۔ آزادی (Freedom) اور خودمختاری (Autonomy) کے تصور کی یہی بنیاد ہے اور یہ دونوں تصورات تحریک تنویر اور تحریک رومانویت کی مشترکہ میراث ہیں۔

مغربی تہذیب میں انسان کے قائم بالذات ہونے کا یہی تصور ہے جو اوپر بیان ہوا۔ اسی لیے ہم مغربی تہذیب کو ایک مکمل اور بدترین گمراہی سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی بقائے باہمی کے قائل نہیں ہیں۔ ہم اسے مکمل طور پر رد کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مغرب کے پاس ایک تصور حق و خیر ہے اور ہمارے پاس ایک دوسرا تصور حق و خیر اور اس بنیاد پر اسلام اور مغرب میں کوئی مکالمہ ہو سکتا ہے۔ مغرب سے کسی مکالمے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا تصور خیر اور تصور حق و خیر صریحاً باطل ہے۔

مغرب کا بنیادی عقیدہ الوہیت انسان:

مغرب کا بنیادی عقیدہ الوہیت انسان کا عقیدہ ہے۔ مغرب کا بنیادی کلمہ لا الہ الا الانسان ہے اور اگر بنیادی کلمہ لا الہ الا الانسان ہے تو مغرب اور ہمارے درمیان مکالمہ ممکن ہی نہیں۔ اس بنیادی فرق کے باعث ہمارے اور مغرب کے درمیان تو بعد المشرقین ہے۔ ہم مغرب کو خالص جہالت تصور کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے مغربی تہذیب وحی کا انکار کرتی ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ حقیقت تک وحی الٰہی کے بغیر (عقل کی بنیاد پر، جبلتوں کی بنیاد پر) رسائی ممکن ہے۔ یہ مغرب کا بنیادی عقیدہ ہے اور اسی عقیدہ کے سبب مغرب مغرب ہے کسی اور وجہ سے نہیں ہے۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس کی تفصیل چند مغربی فلاسفہ کی فکر کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ سب سے پہلے کانٹ کے چند اساسی نظریات کے بارے میں عرض کروں گا۔

کانٹ کا مغربی فلسفے میں مقام:

کانٹ مغربی تہذیب میں بہت ہی بنیادی فلسفی ہے۔ کانٹ کا مغربی فلسفہ میں جو مقام ہے افلاطون کے بعد شاید ہی کسی اور مفکر کا ہو۔

کانٹ کا بنیادی تصور یہ ہے کہ Self یا انسانی ذات کے اندر ہی ایسا نظام اور ترتیب (Order) موجود ہے جو انسانی تجربے کو ہیئت (Form) اور ساخت (Structure) فراہم کرتا ہے اور نتیجتاً انسانی تجربہ کو بحیثیت تجربہ کے ممکن بناتا ہے۔ ذات یا Self کے اس اندرونی نظام کے بغیر تجربہ ممکن نہیں ہوگا۔ ہم محض مختلف قسم کے غیر مربوط احساسات کے مجموعہ کے مالک ہوں گے۔ اسی طرح Self کا یہ Order کائنات کو اور اس میں موجود مختلف اعمال و افعال، اشیاء کو معانی فراہم کرتا ہے۔ کائنات کے اپنے اندر کوئی معانی نہیں ہیں، جب Self کے Order کو کائنات پر مسلط کیا جاتا ہے تو اس کے اندر معانی بھی پیدا ہوتے ہیں اور مختلف احساسات و معطیات باہم مربوط ہو کر تجربہ (Experience) کی شکل بھی اختیار کرتے ہیں۔ الغرض کانٹ کے نزدیک Self کے نظام (Order) کو اگر کائنات پر مسلط کیا جائے تو کائنات کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے جیسا کہ اس کو سمجھنا چاہیے۔ یعنی کائنات کو ایک معقول (Rational) کائنات کے طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو Self کے نظام (Order) کے ذریعے سمجھا جائے۔ تعقل، معانی، ربط و ضبط، نظام، معیشت کا منبع و مصدر انسانی ذات (Self) ہے، اس منبع نور کے باہر کائنات میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے، بے ربطی ہے۔

The Self posesses an order which determines the structure of experience, gives forms & meaning to the world.

اشیاء کا مادی وجود لازمی ہے:

کانٹ کے مطابق Self کو ایک ایسا علم حاصل ہے جو تجربہ سے ماورا ہے۔ (a prior Knowledge) ان معنوں میں ماوراء ہے کہ تجربہ کو تجربہ بننے کے لیے اس ماورائی علم میں شرکت کرنا پڑتی ہے ورنہ تجربہ، تجربہ نہ بن سکے گا اور محض بے ربط احساسات اور معطیات کا ایک مجموعہ (Bundle) رہے گا۔ الغرض کانٹ کے مطابق Self ایک ایسا علم رکھتا ہے جس میں شے (Thing) کے تصورات (Categories) اور اشیاء کے مابین تعلق (Relative) کے متعلق تصورات پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً علت اور نتائج (Causation) کے تصورات اشیاء کے درمیان ربط و تعلق کے بارے میں وہ اطلاع دیتے ہیں (اور یہ اطلاع Self کے پاس موجود ہے) جس کے ساتھ کائنات کی ہر چیز کو ہم آہنگ ہونا پڑے گا ورنہ وہ علم اور تجربہ نہیں بن سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کائنات میں کسی بھی دو یا اس سے زیادہ اشیاء کے درمیان تعلق متصور ہو اور وہ ان تصورات سے ماوراء ہو جو تصور Self میں پہلے سے موجود

ہیں ۔اسی طرح کائنات میں کوئی چیز بھی ان تصورات سے ماوراء نہیں ہوسکتی جو Self میں پہلے سے موجود ہیں ۔مثلاً ایک ایسا تصور مکان (Space) ہے،ایسا ہی ایک تصور زمان (Time) ہے، نیز ایسا ہی ایک تصور مقدار (Quantity) ہے ۔یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شے ہو اور وہ زمان اور مکان میں نہ ہو یا اس کی کوئی مقدار نہ ہو ۔یہ قطعاً ممکن نہیں ہے ورنہ وہ شے ہمارے احاطہ علم میں ہی نہیں آئے گی اور اس کا ہونا نہ ہونا برابر قرار پائے گا ۔

کانٹ اور عرفان ذات:

الغرض کانٹ نے ایک طرف تو یہ کہا کہ عقلیت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ Self کے اندر وہ ترتیب اور نظم (Order) موجود ہے جس کے نتیجے میں اشیاء اور اس کے باہمی ربط و تعلق کو متصور (Conceptualise) کرنے کے لیے ضروری تصورات کا Self کو پہلے سے علم ہوتا ہے ۔لیکن اگر یہ سوال اٹھایا جائے Self خود کیا ہے تو اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا ۔کانٹ کی علمیات میں عرفان ذات کا کوئی تصور موجود نہیں ہے ۔Self جانتا ہے اور جاننے کا ذریعہ ہے لیکن Self خود کیا ہے یہ کوئی نہیں جان سکتا ہمیں جس چیز پر ایمان لانا چاہیے اور اعتقاد رکھنا چاہیے وہ Self کی یہ صلاحیت کہ وہ جان سکتا ہے، علم (Knowledge) تک رسائی حاصل کرسکتا اور اپنے اندر ان تصورات اور اس ترتیب و نظم کو سموئے ہوئے ہے جو علم کو ممکن بنانے کے لیے ضروری ہیں ،اس سب پر ایمان رکھنا ضروری ہے ۔یہی آزادی (Freedom) پر ایمان ہے ۔فریڈم یا آزادی کیا ہے؟ ۔آزادی Self کی اس استطاعت (Capacity) کا نام ہے کہ وہ تمام تصورات کو جان سکے جن پر تجربہ اور علم کی بنیاد ہے ۔لیکن Self کی اس صلاحیت کو ثابت نہیں کیا جاسکتا ۔یہ ایمان اور عقیدے کی بات ہے ۔عقل استخراجی اور عقل استقرائی کسی میں بھی یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ Self کی اس صلاحیت کو ثابت کرسکے ۔یہ تو ایمان کی بات ہے ۔آپ کو اس پر ایمان لانا پڑے گا کہ Self کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ آپ اس کی بنیاد پر دنیا اور اس کی حقیقت تک رسائی حاصل کرسکیں ۔

عقل کی بنیاد پر زماں و مکان سے ماوراء قوانین ایجاد کیے جاسکتے ہیں:

Self کی اس صلاحیت پر ایمان لانے کے بعد ہم ایسے عمومی اصول وضع کرسکتے ہیں اور ایسے قوانین بناسکتے ہیں جو آفاقی ہوں ۔ہم عقل استقرائی اور عقل استخراجی کو استعمال کرکے ایسے اصول وضع کرسکتے ہیں جو عمومی ہوں ،اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو کسی شریعت کی ضرورت نہیں ہے ۔مثلاً کسی ایسے قانون کی ضرورت نہیں ہے جس کی دلیل کتاب اللہ سے نکلتی ہو یا انجیل سے نکلتی ہو وغیرہ ۔ہم خود اپنی عقل کی بنیاد پر ایسے قوانین ایجاد کرسکتے ہیں جو ہر معاشرہ اور ہر ریاست اور ہر نظام میں عمومی طور پر نافذ کیے جاسکتے ہوں اور جس کے نتیجہ میں ایک عادلانہ معاشرہ ،ایک عادلانہ ریاست اور ایک عادلانہ تنظیم ممکن ہوسکے چنانچہ ہمیں کسی کتاب اللہ کی ضرورت نہیں ہے ہمیں کسی شریعت کی ضرورت نہیں ہے ۔ہمیں کسی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے، محض عقل کے استعمال کے ذریعہ ہم وہ قوانین بناسکتے ہیں جو آفاقی ہوں ۔

مثالی معاشرے کا تصور:

اگر ہم ان آفاقی اصولوں پر عمل کریں تو ہم ایک ایسا مثالی (Ideal) معاشرہ قائم کر سکتے ہیں۔ جیسے کانٹ Kingdom of Ends کہتا ہے۔ Kingdom of Ends سے مراد وہ ریاست ہے جہاں ہر فرد کا یہ اختیار تسلیم کیا جائے کہ وہ خود مختار (Autonomous) اور قائم بالذات (Self determined) ہے۔ جہاں ہر شخص اس بات کا تعین کرے کہ وہ کس قسم کی زندگی گذارے گا۔ جہاں ہر شخص کو مقصود بالذات سمجھا جائے۔ ہر شخص کو مساوی خود مختار، مساوی طور پر قائم بالذات ہونا، اور مساوی طور پر مقصود بالذات ہونا تسلیم کیا جائے۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ ہر شخص خیر و شر کا تعین خود کر سکتا ہے۔ یہی کانٹ کا مثالی اور عادلانہ معاشرہ ہے۔ یہی اس کے فکر میں جنت ارضی کا تصور ہے۔ کانٹ نے اس جنت ارضی کا تصور براہ راست عیسائی جنت سماوی (Kingdom of Heaven) کی تردید اور متبادل کے طور پر پیش کیا تھا۔

کانٹ کے افکار کے اجمالی جائزے سے ظاہر ہے کہ اس کے افکار جن پر پوری مغربی تہذیب کھڑی ہے اور مغربی فکر و فلسفہ کا انحصار اس پر ہے لیکن یہ تمام افکار مطلقاً طاغوت ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ عیسائیت کے ساتھ کانٹ کا ایک نوعیت کا تعلق ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ترتیب اور نظم (Order) Self کے اندر خدا نے ہی رکھا ہے وغیرہ۔ کانٹ اس کا انکار نہیں کرتا۔ اس کی کچھ تو جیہات ہیں جس کی بنیاد پر کانٹ کو خاص طور پر پروٹیسٹنٹ عیسائی بنیادوں پر جواز مل سکتا ہے۔ لیکن عملاً جس چیز کی وہ تعلیم دیتا ہے اور جو چیز عام ہوئی ہے وہ یہی خود ارادیت کی تعلیم ہے۔ اس چیز کی تعلیم ہے کہ قانون بھی آپ خود بنا سکتے ہیں اور ماورائے کائنات حقائق کا ادراک آپ خود کر سکتے ہیں۔ وہ خود عیسائی رہا ہوگا لیکن جس چیز کی اس نے ترویج و اشاعت کی وہ تو خالص کفر تھا اور اسی کفر کی بنیاد پر سرمایہ داری اور جمہوریت قائم ہے۔ آزادی کا یہ تصور ہی بعد میں سرمائے کی شکل اختیار کرتا ہے اور عالمی گمراہی کے طور پر مقبول ہوتا ہے۔

ہیگل کا تصور ذات.........اجتماعی:

دوسرا مفکر جو اہم ہے وہ ہیگل ہے۔ ھیگل اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کا فلسفی ہے۔ ھیگل کے تصورات بھی ان معنوں میں بہت اہم ہیں کہ ان کا یورپی فکر پر بہت اثر ہوا ہے۔ ہیگل اور کانٹ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کانٹ کا تصور ذات (Self) انفرادی (Individual) ہے جبکہ ھیگل کا تصور ذات Self اجتماعی (Communitarian) ہے۔ ھیگل کے نزدیک زبان کی بنیاد پر قائم تاریخی اجتماعیت (Historical Language Community) کے تناظر اور سیاق و سباق میں انفرادی Self کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس تناظر کے علی الرغم Self کے کسی تصور کو متصور کرنا محض ایک خام خیالی اور abstraction ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل Self جو قائم اور موجود ہے وہ اجتماعیت پر مبنی Self ہے اور فرد کا کام اس Self میں شریک ہونا ہے۔ مثلاً جرمن قوم کا Self اصل میں موجود ہے، اور یہ Self جرمن تاریخ، جرمن تہذیب اور جرمن تاریخی تجربہ

(Historical Experience) میں اپنا اظہار کرتا ہے۔

ہیگل کے یہاں Self کا تیسرا تصور: خدا تاریخ کے ذریعے تخلیق ہو رہا ہے:

لیکن ہیگل کے یہاں انفرادی اور اجتماعی Self کے علاوہ Self کا ایک تیسرا تصور بھی ہے جسے وہ ذات مطلق (Absolute Self) کہتا ہے۔ اسی ذات مطلق (Absolute Self) کو وہ روح کائنات (Geist) بھی کہتا ہے اور دوسرے نام بھی ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہیگل نے ذات مطلق کا تصور مذاہب خاص طور پر عیسائیت سے لیا ہے اور اسی لیے بعض لوگ اسے عیسائی مفکر بھی سمجھتے ہیں لیکن ہیگل کے ذات مطلق اور عیسائیت کے تصور خدا میں ایک بہت بنیادی فرق ہے۔ عیسائیت اور مذاہب کے نزدیک خدا ازل سے اپنی مکمل صورت میں موجود ہے اور اس نے کائنات کو عدم سے تخلیق کیا ہے۔ خدا زمان و مکان سے ان معنوں میں بالا ہے کہ اس کی ذات و صفات میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہے لیکن ھیگل یہ کہتا ہے کہ ذات مطلق کہیں بھی مکمل صورت میں موجود نہیں ہے۔ ذات مطلق محض ایک مجرد تصور ہے۔ لیکن جب یہ ذات مطلق زمان و مکان میں داخل ہوتی ہے تو یہ مجرد تصور ایک عملی شکل (Actualization) حاصل کرتا ہے۔ تاریخ اس ذات مطلق کی خود تخلیقیت (Self Creation) اور خود تشکیلیت (Self Constitution) کا سفر ہے۔ جب خود تخلیقیت کے اس عمل کے ذریعہ ذات مطلق اپنے آپ کو مکمل کرے گی تو تاریخ ختم ہو جائے گی۔ اسی کو ھیگل اختتام تاریخ (End of History) کہتا ہے۔ اگر مذہبی زبان میں اس بات کو بیان کریں تو ھیگل کے نزدیک (نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ) خدا تاریخ کے ذریعے اپنے آپ کو خلق کر رہا ہے، اپنے آپ کو مکمل کر رہا ہے۔

ہیگل نپولین کو خدا کا اظہار سمجھتا تھا:

اب ھیگل کے نزدیک ذات مطلق خود تخلیقیت اور خود تشکیلیت کے اس سفر کو زبان کی بنیاد پر قائم تاریخی اجتماعیتوں اور ان تاریخی اجتماعیتوں کے جلو میں ظہور پذیر ہونے والی نابغۂ روزگار شخصیات کے ذریعہ کرتی ہے۔ مثلاً جرمن قوم کی تاریخ، تہذیب، ادارے ذات مطلق کی تکمیل سفر کے مختلف لمحات ہیں۔ اسی طرح مثلاً نپولین کو ھیگل فی الواقع خدا کا اظہار سمجھتا تھا۔ اور ۱۸۰۶ء میں جب نپولین نے جرمنی پر حملہ کیا تو ھیگل نے باوجود اس کے کہ وہ جرمن تھا اس کا خیر مقدم کیا خدائی تعظیم کے ساتھ کیا اور اپنی کتاب Phenomenolgy of Self اس کے نام معنون کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ھیگل کے نزدیک نپولین ذات مطلق کا اظہار تھا۔ تو انفرادی Self اور اجتماعی Self دونوں ذات مطلق کی خود تخلیقیت اور خود تشکیلیت کے عملی آلۂ کار (Vehicale) ہیں۔ اسی کو ھیگل عقل کی مکاری [Cunning of Reason] اور تاریخ کی مکاری [Cunning of History] کہتا ہے۔

تاریخ خیر وشر کا اصل پیمانہ ہے:

ان دونوں اعمال [Processes] یعنی [Cunning of Reason] اور [Cunning of History] کے ذریعہ تاریخی اجتماعیتیں حق کے اظہار پر مجبور ہیں۔ چنانچہ تاریخی اجتماعیتوں کی تاریخ، طرز حیات ہی خیر وشر، اخلاقیات کے واحد پیمانے ہیں۔ اخلاقیات وہ نہیں ہے جو انجیل اور قرآن میں لکھی ہے بلکہ اخلاقیات سے مراد یہ ہے کہ تاریخی اجتماعیت نے ارتقاء (Development) کے لیے جو معیارات خیر وشر مقرر کیے ہیں، انہی سے اخلاقی معیارات اور پیمانے تشکیل پاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کسی زمانے میں قرآن اور انجیل اخلاقیات کے پیمانے فراہم کرتے ہوں کیونکہ وہ اس زمانے کی تاریخی اجتماعیتوں کی اخلاقیات کے اظہار تھے لیکن اب وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور اجتماعیتوں نے اخلاقیات کے اظہار کے جو نئے زینے عبور کیے ہیں انہوں نے قرآن اور انجیل کو ازکار رفتہ شے بنا کر رکھ دیا ہے۔

تاریخ میں اخلاقی پیمانے بدلتے رہتے ہیں:

اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ میں تغیرات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اخلاقی پیمانے، خیر وشر کے معیارات بدلتے رہتے ہیں اور ہر آنے والا وقت پہلے سے بہتر ہے اور اس کے پیمانے پہلے دور کے مقابلے میں فوقیت رکھتے ہیں کیونکہ ہر آنے والے دور میں ذات مطلق اپنی تخلیق اور تکمیل کے اگلے اور برتر مرحلے میں داخل ہو چکی ہوتی ہے۔ اسی کا نام ترقی (Progress) اور Development ہے۔

خیر وشر کا پیمانہ ترقی ہے:

اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ ھیگل کے نزدیک خیر وشر کا جو پیمانہ ہے وہ ترقی (Development) ہی ہے اور جو تاریخی اجتماعیت جتنی زیادہ ترقی کر گئی وہ اسی قدر معیار حق وباطل اور معیار خیر وشر ہوگی اور چونکہ سب سے زیادہ ترقی جس اجتماعیت (Community) نے کی ہے، اور سب سے زیادہ غلبہ جس نے حاصل کیا ہے وہ مغرب ہے اس لیے مغرب اور اس کی تاریخ اور تہذیب، اداراتی صف بندی، آدرشیں ہی حق وباطل کا معیار ہیں۔ اور چونکہ مغرب کی ترقی کے آگے کسی ترقی کا تصور نہیں ہوسکتا اس لیے مغربی تہذیب ہی بنیادی طور پر ذات مطلق اور روح کائنات کا اظہار مکمل ہے۔ اسی لیے مغربی تہذیب کا غلبہ تکمیل ذات مطلق ہے اور اسی لیے اب دائمی ہے اور اس دوام کو کبھی زوال نہیں آئے گا اس لیے ہر تہذیب اور ملت کو مغرب کی تہذیب، آدرشوں، اداروں کو خیر مطلق کی حیثیت سے قبول کر لینا چاہیے۔ ان معنوں میں تاریخ اب ختم ہو گئی ہے۔

ہیگل امریکا کا سب سے بڑا مداح:

اور اسی لیے سب سے زیادہ توقع اور امید اور سب سے زیادہ مدح سرائی ھیگل کے ہاں امریکہ کی ہے۔ وہ کہتا ہے اصل میں امریکہ مغربی تہذیب کی روح کا خالص ترین اظہار ہے۔ حالانکہ

ھیگل کے دور میں امریکہ کی کوئی خاص سیاسی حیثیت نہیں تھی جو آج ہے اس کے باوجود وہ کہتا ہے کہ مغربی تہذیب کے آدرشوں اور افکار کے سب سے نیا دہ اظہار اور سب سے زیادہ ترقی کا امکان امریکہ میں ہے۔

تاریخ کے خاتمے کا مطلب کیا ہے؟

الغرض مغربی تہذیب کا غلبہ دائمی ہے۔ جب مغرب میں یہ کہا جاتا ہے کہ تاریخ کا خاتمہ ہو چکا ہے تو وہ ان معنوں میں کہ اس کے بعد کسی بنیادی تغیر کا امکان ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد حق کے مزید کسی ادراک کا کوئی امکان نہیں ہے۔ فی الواقع تحریک تنویر نے جو تصورات پیش کیے ہیں بالخصوص آزادی کا تصور، وہ قدر مطلق ہے اور اس قدر مطلق کو آفاقی طور پر مستحکم کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ مغربی تہذیب کی عالمگیریت اور آفاقیت کو نہ صرف یہ کہ تسلیم کیا جائے بلکہ اس کو ممکن بھی بنایا جائے اور اس کی راہ میں حائل ہر خطرے کو ہر قیمت پر ختم کر دیا جائے۔

مغرب ایک دنیا تعمیر کر رہا ہے، یہ دنیا نا قابل تغیر اور نا قابل تردید ہے۔ تاریخ کا اختتام ان معنوں میں ہو چکا ہے کہ مغربی تہذیب نے جن آدرشوں کو پیش کیا ہے انہیں نہ صرف یہ کہ آفاقی حق کے طور پر قبول کرے گی بلکہ اس کے اظہار کا موقع بھی دے گی مغربی تہذیب کا غلبہ ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ تحریک تنویر اور تحریک رومانویت نے جن آفاقی نظریات کو پیش کیا تھا ان کے سامنے بند باندھنا ممکن نہیں ہے۔

جنھوں نے ھیگل کو پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ھیگل کی رومانوی اور تنویری تعبیریں یکساں طور پر ممکن ہیں۔ اور روسو کی طرح ھیگل بھی تہذیب مغرب کے ان دو دھاروں کے ملاپ کا کام کرتا ہے۔

مغرب میں "خیر" نہیں "ارادہ" غالب ہے:

اوپر ہم نے کانٹ اور ھیگل کا جو تصور پیش کیا ہے وہ یہ تصور تھا کہ مغربی تہذیب اور اقدار کا غلبہ انسانیت کی فلاح اور خیر کی چیز ہے۔ لیکن تحریک رومانویت سے ایک اور دوسرا دھارا بھی نکلتا ہے جو مغرب تہذیب کو فلاح و خیر وغیرہ نہیں گردانتا۔ مثلاً شوپنہار کے ہاں تو بالخصوص یہ بنیاد موجود ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے غلبہ کو فی الواقع خیر نہیں تصور کرتا ہے بلکہ کہتا ہے کہ جو چیز غالب (Dominant) ہوئی ہے وہ ارادہ (Will) ہے۔ جس چیز نے مغرب کے ذریعہ غلبہ حاصل کیا ہے وہ عقل نہیں ہے بلکہ Will ہے اور ارادہ ایک اندھی قوت (Blind Force) کا نام ہے۔ اس اندھی قوت نے دنیا کو غم اور دکھ سے بھر دیا ہے۔ اس قوت اور اس کے غلبہ کو کسی صورت روکا نہیں جا سکتا ہے۔ یہ قنوطیت کا غلبہ مغربی فلسفیوں میں شروع سے چلا آ رہا ہے حتیٰ کہ فوکالٹ (Foucault) میں بھی جو بیسویں صدی کا مفکر ہے اور ۱۹۸۴ء میں مرا ہے۔ اس کے افکار پر بھی یاسیت و قنوطیت شدت کے ساتھ غالب ہے۔

مغربی تہذیب میں یہ دونوں دھارے موجود ہیں۔ ایک طرف تو پرامید (Optimistic)

تصور ہے کہ مغربی تہذیب کا غلبہ خیر وفلاح ہے دوسری طرف قنوطی تصور ہے جو اس کو خیر وفلاح نہیں سمجھتا ہے لیکن مغربی غلبہ کی ناگزیریت پر دونوں یک زبان ہیں۔

اسی دوسرے دھارے کا اظہار ایک اور فلسفی کرتا ہے جس کا نام ہے کرکیگارڈ (Kierkegard) ہے۔اس کے ہاں یہ خیال موجود ہے کہ انسان جو کچھ پسند کرتا ہے اس کو ہم عقلی بنیادوں پر جواز (Justify) فراہم نہیں کرسکتے۔آپ کوئی عقیدہ اختیار کرتے ہیں، کوئی طرز زندگی پسند کرتے ہیں، اس کا انتخاب کو آپ نہ عقل کی بنیاد پر نہیں کرتے ہیں کسی چیز کے حق اور ناحق ہونے کا معیار یہ نہیں ہے کہ آپ کیا چنتے ہیں بلکہ وہ اس بات پر منحصر ہے کہ آپ اسے کیسے چنتے ہیں۔کسی چیز کی اپنی کوئی قدر نہیں ہوتی ہے، جس انداز میں آپ اس چیز کو اپناتے ہیں وہ اس میں قدر پیدا کرتی ہے یا اس کو بے قدر بناتی ہے۔انگریزی میں ہم اس کو یوں ادا کرسکتے ہیں کہ

It is not important what you choose, but how you chose it.

"یہ اہم نہیں ہے کہ تم کیا چنتے ہو بلکہ اہم یہ ہے کہ تم کیسے چنتے ہو"

یہ اہم نہیں ہے کہ تم ہندو ہو یا مسلمان ہو یا لبرل ہو، کیونکہ یہ تمام طرز ہائے زندگی اور عقائد یکساں طور پر بے قدر (Value less) ہیں۔بلکہ جس شدت کے ساتھ آپ کسی طرز زندگی کے ساتھ وابستہ ہوں گے بغیر کسی دلیل کے اسی قدر اس طرز زندگی کی قدر ہوگی شدت وابستگی کسی چیز میں قدر پیدا کرتی ہے۔اس کو انگریزی میں کہیں گے۔

Choosing passion determines your access to the good.

اور اس کی معراج یہ ہے کہ جو عقیدہ اور طرز زندگی سب سے زیادہ لایعنی، مہمل اور عقلی طور پر تضادات کا مجموعہ ہوگا اس کو اگر اس تمام لایعنیت، اور تضادات عقلی کے باوجود شدت جذبات کے ساتھ یکسو کر قبول کیا جائے تو یہ ایک ایسی زندگی کا اظہار ہوگا جو کہ قدر اعلیٰ کی اعلیٰ ترین منزل ہے۔کرکیگارڈ کا یہ خیال بیسویں صدی میں نہایت اہم ہو جاتا ہے کیونکہ آج مغربی تہذیب کی لایعنیت مغربی مفکرین پر اظہر من الشمس ہے۔لیکن اس لایعنیت کو اسی شدت کے ساتھ گلے لگائے رکھنے کو Authenticity کی معراج سمجھا جارہا ہے۔

مارکس کے افکار:

مارکس کو ہم کسی نہ کسی حد تک اسی تناظر میں دیکھ سکتے ہیں۔مارکس پسند و ناپسند اور اختیار کی اس لایعنیت کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ شوپنہاور اور کرکیگارڈ کے یہاں پسند و اختیار کی لایعنیت کا جو خیال موجود ہے وہ دراصل ایک خاص معاشی نظام کی بالادستی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔اگر اس نظام یعنی سرمایہ داری کو کسی نہ کسی صورت سے آپ ختم کر دیں تو اس کے نتیجہ میں لایعنیت یا جسے وہ اجنبیت (Alienation) کا نام دیتا ہے ختم ہو جائے گی۔

آپ جو چاہیں کریں:

مارکس کی ایک سے زیادہ تعبیریں ممکن ہیں لیکن اس تفصیل میں یہاں نہیں جاؤں گا صرف اہم اہم اور موٹی موٹی باتیں عرض کروں گا۔ مارکس کا بنیادی خیال یہ ہے کہ اختیار و پسند کی لایعنیت سرمایہ داری کا شاخسانہ ہے۔ سرمایہ داری نے پسند و اختیار کو حقیقی (authentic) رہنے ہی نہیں دیا۔

حقیقی رواقعی (authentic) اختیار (Choice) کا مطلب یہ ہے کہ انسان غلام (Slave) نہ رہے بلکہ آقا (Master) بن جائے۔ آقائی اور خودمختاری کے لیے ضروری ہے کہ آپ طبقاتی جدوجہد کے ذریعہ پرولتاریوں کی آمریت قائم کریں تا کہ سرمایہ داری نظام سے اوپر اٹھ کر وہ جنت ارضی حاصل کی جا سکے جسے مارکس کمیونزم کہتا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ جنت ارضی قائم ہو جائے گی اور آپ خودمختار اور آقا بن گئے تو کیا آپ کو اختیار کی لایعنیت سے رستگاری نصیب ہو گی یا نہیں؟ اب اگر مارکس نے جو کمیونسٹ معاشرے کے خدوخال بیان کیے ہیں ان کا جائزہ لیں آپ دیکھیں گے کہ یہاں بھی اختیار کی لایعنیت عود کر آتی ہے۔ کمیونسٹ سوسائٹی وہ ہے جس میں کسی بھی چیز کی حقیقی قدر نہیں ہے۔ جس کا جو جی میں آئے کرے۔ یہی مارکس کا تصور ہے کمیونسٹ سوسائٹی کا۔ جب ہر چیز کی قدر برابر ہے (یعنی کہ کوئی قدر نہیں ہے) اور آپ جو چاہیں کریں تو اختیار کی لایعنیت کا عود کر آنا ایک یقینی بات ہے۔ اس لحاظ سے کانٹ کی Kingdom of Ends اور کمیونسٹ سوسائٹی میں بڑی مماثلت ہے کہ دونوں میں اختیار کی لایعنیت (absurdity of Choice) اور اختیار کی آفاقیت (Universality of Choice) عود کر آتے ہیں۔ اختیار کی آفاقیت اور اختیار کی لایعنیت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ جب آپ اس کے لیے تگ و دو کرتے ہیں کہ آپ جو چاہیں کریں (اختیار کی وسعت) تو کسی چیز میں بھی کوئی حقیقی قدر (Intrinsic Value) باقی نہیں رہتی اور زندگی فی الواقع ایک تماشہ بن جاتی ہے۔

مارکسی معاشرے میں مقصدِ زندگی کا تصور کیا ہے؟

اس کی واضح تصویر مارکس کے کمیونسٹ معاشرے کے تصور میں ہمیں ملتی ہے۔ کمیونسٹ معاشرے میں مارکس کہتا ہے آپ کی جو مرضی میں آئے گا وہ آپ کر سکیں گے۔ صبح کو مچھلی پکڑیں، شام کو گانا گائیں وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اختیار کی لایعنیت کو ان معنوں میں رد نہیں کرتا اور اسے ایک اچھی چیز کے طور پر قبول کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ انسان کی آزادی ہے کہ جو چاہے کرے۔ اس کی نظر میں زندگی ایک کھیل ہے۔ جس میں جو دل چاہے آپ کھیلیں اور فی الواقع قدر (Value) کچھ نہیں ہے اور قدر صرف وہ ہے جو آپ چاہیں کہ قدر ہو۔ یہ تصور بعد میں دوسروں کے یہاں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عملاً سرمایہ داری اور اشتراکیت جو معاشرہ پیدا کرتے ہیں بالکل ایک جیسے معاشرے ہوتے ہیں ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ایک دوسرے میں ضم ہونا ان کے لیے ممکن ہے۔ اشتراکی ریاست، سرمایہ دارانہ ریاست ہو جاتی ہے اور سرمایہ دارانہ ریاست اشتراکی ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر ان کے یہاں کوئی خیر کا تصور موجود ہی نہیں ہے۔

مابعد الطبیعاتی سوالات کے انکار کا مکتبہ فکر:

اب چند باتیں Positivists کے بارے میں۔ Posiitivists ایک ایسا مکتبہ فکر ہے جو انیسویں صدی کے اواخر میں ظہور پذیر ہوا اور اس نے سرے سے حقیقت (Ontological) سے متعلق سوالوں کی ضرورت ہی سے انکار کر دیا اس نے کہا یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ کائنات کیا ہے اور انسان کیا ہے اور حقیقت کیا ہے یہ لاحاصل بات ہے ان حقائق تک رسائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس مکتبہ فکر میں واحد استثناء ہے (یہ بعد میں عرض کروں گا کہ Wiltgenstein نے ایسا نہیں کہا کہ حقائق کے حصول کی کوشش نہیں کرنا چاہیے) سب سے اعلیٰ مقام Positivists میں Wittgenistein کا ہی ہے۔

Positivists کے مطابق Ontological حقائق کے ادراک کی کوشش کرنا فعل عبث ہے اور ہمیں اس سے باز آ جانا چاہیے مثلاً یہ جو Ontological حقائق کی بات لوگ کرتے ہیں کہ انسان کیا ہے اور کائنات کیا ہے اور خیر کیا اور حق کیا ہے تمام چیزیں یہ سب کچھ نفسیات کاری ہے۔ یعنی انسان اپنے نفس کے اندر چند جبلتیں رکھتا ہے جن کی بنیاد پر وہ فی نفسہٖ کچھ باتیں کہتا ہے لیکن ان کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے اور علمی حیثیت صرف ان چیزوں کی ہے جن پر ہم منطقی ذرائع سے پہنچتے ہیں یا جو تجربات کے ضمن میں ہم جانتے ہیں۔ ماورائی حقائق (Ontological Truth) تک ہم رسائی حاصل نہیں کر سکتے ۔ اس چیز کے انکار کی ایک شکل Phenomnology ہے اور دوسری شکل Hermanutics کی ہے(Hermanutics پہلے اور Phenomnology بعد میں)۔ اس میں ایک ردعمل پیدا ہوا کہ نہیں یہ ممکن ہے کہ --- فرض کریں ہم یہ بات تسلیم کر بھی لیں کہ ماورائی حقائق کی دسترس ہمیں اپنے نفس سے حاصل ہوتی ہے تو ہم ایسی سائنس ایجاد کر سکتے ہیں کہ جس وقت ہم انسانی تجربات کی منظم انداز میں [System atically] توجیہہ [Interpret] کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ تو ہم ان تجربات کے اصلی معانی بیان کر سکیں گے۔ اس سائنس کو ہم کہتے ہیں [Hermanutics] اور Habermas کے ہاں یہ تصور موجود ہے کہ جو کچھ بھی انسانی تصورات ہیں ان کا سائنسی اور منظم اور مرتب تجزیہ حقائق کے ادراک کا ایک صحیح ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اس میں کچھ مفکرین نے بالخصوص Dilthey نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ تجربے جو انسان کے تاریخی تناظر سے متعین ہوتے ہیں اور انسان کی تاریخی پوزیشن سے متعین ہوتے ہیں لہٰذا ان تجربات کا تجزیہ اس چیز کا امکان رکھتا ہے کہ حقائق کا مختلف النوع ادراک کیا جائے۔

اضافیت (Relativism) کے مطابق کوئی بھی ادراک آفاقی حقائق کو جائز نہیں کرتا بلکہ وہ ایک ایسے سچ کو جائز کرتا ہے جو صرف اضافی طور پر درست ہوتا ہے۔ مخصوص تجربات کے تاریخی سیاق وسباق کے حوالے سے صداقت متعین کی جا سکتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم آفاقی سچائیوں کا ادراک علم التعبیر اور علم توجیہہ کے ذریعے نہیں کر سکتے اور Hermeneutics میں یہ گنجائش موجود ہے کہ

اضافیت دوبارہ کسی نہ کسی شکل میں امکان کے طور پر وجود رکھے۔ مغربی تہذیب کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ وہ ایسے مصدقہ اصول دریافت کرسکتی ہے کہ جن کی بنیاد پر تمام معاشرے اور تمام ریاستوں کے نظام کو مرتب کریں تو عدل قائم ہوجائے گا۔ مغربی تہذیب کی فلسفیانہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عدل کا تصور، تصورِ نفس سے اخذ کردہ ہے جب کہ تصورِ نفس، تصورِ عقلیت میں مضمر ہے۔ جس کا پرچار کانٹ، ہیگل وغیرہ کی فکر میں ملتا ہے۔ اگر اضافیت کو قبول کرلیا جائے تو مغربی تہذیب کی آفاقیت خطرے میں پڑ جائے گی یعنی مغربی تہذیب وہ اصول تو مرتب کرسکتی ہے جو ان کے اپنے تاریخی اصولوں سے متعین ہوتے ہیں لیکن ایسے اصول وہ نہ تخلیق کرسکتی ہے نہ متعین کرسکتی جو تمام معاشروں اور تمام تاریخوں کے لیے یکساں طور پر محیط ہوں اور ان کی بنیاد پر ان تہذیبوں کو، ان کے تجربات کو جانچا جاسکے۔ لہٰذا Relativism، مغربی تہذیب کی آفاقیت کے لیے ایک خطرہ ہے۔ یہ وہی مغربی بالادستی کی قنوطی (Passimistic) تعبیر ہے جو شوپنہار سے شروع ہوتی ہے اس کی ایک تشریح ہے جو کہ بعد میں جا کر فوکو کے ہاں یا جسے کہتے ہیں Structuralist کے ہاں یا جسے ہم Post Modern تحریک کہتے ہیں اس کے ہاں زیادہ واضح شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔

نطشے اور برگساں: حق کے بجائے غلبہ:

نطشے اور برگساں بھی دو اہم فلسفی ہیں ان کے ہاں بھی وہی تسلسل افکار continuation موجود ہے۔ مغربی تہذیب کی بالادستی کو آفاقی اصولوں کی بنیاد پر ثابت Justify کرنا، لیکن اس طریقے سے کہ مغرب کو ایک فاتح کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ نطشے کے ہاں جو بنیادی تصور ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک قانون ایسا موجود ہے کہ جو تمام انسانیت کے اوپر لاگو ہے وہ ہے اس اصول کو نطشے (Nietzsle) The Will to Survive یا Power کا نام دیتا ہے اس سے مراد ہے کہ ہر آدمی، ہر فرد، ہر معاشرہ اس پر مجبور ہے کہ اپنی بقاء (Survival)، کے لیے جدوجہد اور جستجو کرے جو چیز اہم ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہم حق تک رسائی حاصل کریں۔ یہ ضمنی سوال ہے کہ ہم حق تک کتنی رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔

اصل اہمیت حق کی نہیں غلبہ کی ہے:

اصل سوال یہ ہے کہ ہمیں غلبہ حاصل ہوتا ہے یا غلبہ حاصل نہیں ہوتا۔ اصل سوال یہ ہے کہ ہم (Survive) کرسکتے ہیں یا نہیں کرسکتے۔ Super Man وہ شخص ہے جو زندگی کو اس طریقے سے گزارتا ہے کہ وہ غالب (Super Dominent) حیثیت اختیار کرلیتا ہے اور وہ اس اخلاقیات (Morality) کو عام کرتا ہے جو غلبہ پانے والے (Master) کی اخلاقیات Morality ہوتی ہے۔ غلام کی اخلاقیات (Morality) نہیں ہوتی۔ اصل جو کوشش اور جدوجہد اور تجربے کا مرکز و محور یہ ہونا چاہیے کہ ہم کس حد تک غالب آسکتے ہیں اور ہم کس حد تک اپنے ارادے کو مسلط کرسکتے ہیں ایک غلام نسل (Slave Race) پر اور ہم اپنی زندگی کو ایک ادب کے نمونے (Work of art) کی طرح

گزار سکتے ہیں زندگی میں جس چیز کی تلاش ہے وہ حسن کی تلاش ہے اور حسن کی تحسین وتعریف ہے۔ زندگی ادب کا ایک نمونہ ہونی چاہیے۔

اخلاقی سوالات اصل سوالات نہیں:

اخلاقی سوالات اصل سوالات نہیں ہیں ۔اصل سوالات تو یہ ہیں کہ ہم کتنے جمالیاتی (Artistic) معاشرے تخلیق کرتے ہیں یا زندگی گزارتے ہیں اور جس کے نتیجے میں ہم ایک نظام کے اندر کتنا زیادہ غلبہ حاصل کرتے ہیں اور کس حد تک ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ اپنی شخصیت کو غالب کر سکیں اپنی تہذیب کو غالب کر سکیں ایک پورے معاشرے کے اوپر اس کے حساب سے ہم بقاء(Survive) حاصل کریں اس کے سوا حق کی کوئی اصل نہیں۔

خواہشات نفس ہی ''حق'' ہے:

Phenomnolgy کے بارے میں کچھ باتیں الگ سے بھی عرض کر سکتے ہیں لیکن میرے خیال میں صرف اتنی بات کافی ہے ۔باقی تمام چیزیں حذف کرتا ہوں ۔صرف اتنی بات جو Phenommolgy کے اندر سے نکلتی ہے کہ انسان کو حق اپنے اندر ہی تلاش کرتا ہے (The Self must find in itself) حق کے تلاش کرنے کی جگہ Self خود ہے ۔چنانچہ معروضیت (Objectivity) کا حصول اسی وقت ہوتا ہے جب انسان مکمل داخلی (Totally Subjective) ہو جائے ۔جس وقت ایک شخص پورے طور پر اپنے آپ کو اپنے نفس کے سپرد کر دیتا ہے اور اپنے نفس کی کیفیات کا ادراک کر لیتا ہے تو اس وقت ہی وہ حق کا ادراک کرتا ہے ظاہر ہے کہ یہ نفس کوئی عابد نفس نہیں ہے ۔وہ نفس نہیں ہے کہ جو ماتحت ہے کسی رب کے بلکہ جو خود ہی رب ہے اور جو خود ہی حق کا خالق ہے خود ہی حق کا مالک ہے اور اس کا ادراک جب آپ پورے طریقے سے کریں گے اسی وقت خود ارادیت کا کوئی مطلب نظر آتا ہے چنانچہ Phenomnenolgy کی یہ تعلیم کہ انسان اسی وقت حق کا ادراک کرتا ہے جس وقت وہ نفس کے تابع ہو جاتا ہے یا نفس کو پورے طریقے سے سمجھتا ہے تو یہ وہی چیز ہے کہ جو Kant کے ہاں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے کہ order نفس کے اندر پہلے سے موجود ہے Already Exist کرتا ہے۔

فرائیڈ کے یہاں حق کا مقام تحت الشعور ہے:

اس کے بعد بیسویں صدی کے شروع اور انیسویں صدی کے آخر میں جو فلسفی بہت اہم رہا ہے وہ فرائیڈ ہے ۔فرائیڈ کے ہاں یہ تصور کہ نفس کے اندر ہی سے حق کا ادراک نکلتا ہے پورے طریقے سے واضح ہو کر آتا ہے ۔وہ تصور یہ ہے کہ حق کا اصلی مقام Sub-concious ہے یعنی تحت الشعور۔ تحت الشعور میں جو قوت غلبہ پاتی ہے جو طاقت غالب آتی ہے اس کو فرائیڈ کہتا ہے Libido لیکن Libido ایک تباہ کرنے والی اور ایک حیوانی خصوصیت ہے ۔جس وقت آپ اپنے آپ کو نفس کے سپرد

کرتے ہیں اور تحت الشعور میں نفس کو تلاش کرتے ہیں تو وہ حق جس کا ادراک کرتے ہیں شیطانی ہے۔ آپ کی [Idis Impulses] جب آپ کائنات کو دیکھتے ہیں اس کی اصلیت جانتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ کائنات تو شیطانی ہے۔ یہ کائنات تو جنگلی ہے، یہ کائنات تو بہیمیت کی غماز ہے۔ چنانچہ تہذیب کو قائم کرنے کے لیے لازم ہے کہ نفس (ego)، Libido پر غالب آئے۔ اگر Ego، Libido پر حاوی نہیں آئے گا تو تہذیب برقرار نہیں رہ سکتی چونکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ایک حیوان ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کے اندر جو خواہشات اور میلانات ہیں وہ تہذیب کش ہیں وہ تہذیب کو تباہ کرنے والے ہیں۔ چنانچہ حق کو جاننا اس چیز کو جاننا ہے کہ کائنات شیطانی ہے اور انسان کی اپنی ماہیت شیطانی ہے اور تہذیب کا قیام اسی شیطان کے خلاف ایک جدوجہد ہے اور ان معنوں میں وہ کامیاب نہیں ہوسکتی کہ جس وقت آپ اپنی اصلیت کو دبا (Supress) دیتے ہیں، جس وقت ego، Libido کے اوپر حاوی آئے گا تو آپ دراصل اپنی ذات کی نفی کریں گے اور موت کی خواہش آپ کے اوپر حاوی آجائے گی۔ چنانچہ شوپنہار کے ہاں تصور چلا آرہا ہے کہ بنیادی طور پر Will شیطانی ہے یہ تصور فرائیڈ کے ہاں پوری طرح منعکس ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ کہتا ہے کہ ہم نے اپنے نفس کو دیکھا اور ہم نے دیکھا کہ نفس خود ارادیت کے اظہار کا نام ہے اور خود ارادیت تو Libido یعنی [Idish Impulses] کا اظہار] اور وہ خواہشات جو انسان کو حیوان بناتی ہیں کے اظہار کا طریقہ ہے اور تہذیب تو وہ ملمع ہے جس کے اندر وہ چیزیں محصور رہتی ہیں۔

وٹگنسٹائن حق کو دنیا کے باہر سمجھتا ہے:

اس کے بعد ہم بیسویں صدی کے ایک اور بہت بڑے فلسفی کا تذکرہ کرتے ہیں جس کا نام Wittgenstein ہے۔ Wittgenstein بھی ایک Positivist ہے ان معنوں میں ہے کہ وہ کہتا ہے کہ عقلی ذرائع سے Ontological حقائق کا ادراک نہیں کیا جاسکتا اور بالخصوص Ontological حقائق کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن وہ دوسرے Positivists سے ان معنوں میں بہت مختلف ہے کہ وہ کہتا ہے گو کہ Ontological حقائق کا تعقل کی بنیاد پر ادراک نہیں کیا جاسکتا اس کا اپنا جملہ یہ ہے [Ontological۔MetaPhysics is unsayable] حقائق کو آپ بیان نہیں کرسکتے لیکن اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ دنیا خود کوئی حقیقت نہیں ہے۔ دنیا کے اندر نہ حق ہے نہ قدر ہے۔ اگر کہیں حق ہے اور اگر کہیں قدر ہے تو وہ دنیا کے باہر ہے دنیا کے اندر نہ حق ہے نہ قدر ہے اور دنیا کے اندر حق تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ایک زمانے میں جب اس نے کتاب لکھی تھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ زبان کو حق کے ادراک کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے اور Language کو آفاقی حیثیت دیتا ہے۔ لیکن اس کی اپنی تحریر اس کا انکار کرتی نظر آتی ہے کہ زبان کے تجزیے (Analysis) کے ذریعے حق تک کوئی رسائی ممکن ہے وہ کہتا ہے محض زبان کے کھیل ہیں لوگ محض زبان کے کھیل کھیلتے ہیں جس سے کوئی آفاقی سچ اور حق اخذ نہیں کرسکتے لیکن اس کے باوجود وہ کہتا یہ ہے کہ آفاقی حقائق کا ادراک بہت

اہم ہے اور جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ ہم عقل کے ذریعے حق کا ادراک نہیں کر سکتے۔ یہ کہ عقل سے اوپر اٹھنے کی ضرورت ہے عقل سے اوپر کیسے اٹھا جائے۔ اس کے بارے میں وہ خاموش ہے۔ اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہتا عقل سے اوپر کیسے اٹھا جائے لیکن وہ MetaPhysical اور Ontological Realities کی اہمیت اور اصلیت سے اور ان کی ضرورت سے انکار نہیں کرتا اور ان معنوں میں وہ دنیا کو ہیچ اور دنیا کو غیر ضروری سمجھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دنیا میں حق اور خیر موجود نہیں ہے۔ اگر حق اور خیر موجود ہے وہ کہاں موجود ہے اور اس تک کیسے رسائی حاصل کی جا سکتی ہے، اس کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ وہ اس سلسلے میں خاموش رہتا ہے وہ کہتا ہے اس کا کوئی جواب دیا نہیں جا سکتا۔ اور ان معنوں میں اس میں اور Heideger میں۔ جو بیسویں صدی کا ایک اور اہم فلسفی ہے، بڑی مماثلت ہے۔

ہائڈ یگر اور مابعد الطبیعیاتی سوالات کا جواب:

Heideger کہتا ہے کہ انسان محض دنیا میں پھینک دیا گیا ہے He has been thrown in the world. لیکن وہ اس پر مجبور ہے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا میں پاتا ہے اور اسے نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا اس کی زندگی کی کیا حیثیت ہے کائنات میں اس کا کیا مقام ہے اس کے پاس کوئی جواب موجود نہیں ہے لیکن وہ اس بات پہ مجبور ہے کہ وہ ان سوالات کا جواب تلاش کرے۔ Heideger کہتا ہے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا لیکن اگر آپ کو ایک ایسی زندگی گزارنا ہے جو معنی خیز زندگی ہے، جو Valuable زندگی ہے تو ان سوالات کا جواب آپ کو مستقل تلاش کرتے رہنا چاہیے۔ اور وہ کہتا ہے کہ مغربی تہذیب کا زوال اسی میں ہے کہ اس نے being کے سوال کو، Ontological سوالات کو جن کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ہوں بھولنے کی کوشش کی اس وجہ سے مغربی تہذیب ایک مکینیکل اور ٹیکنالوجیکل تہذیب ہو کر رہ گئی ہے۔ معنی اور معنویت غائب ہو گئی ہے یعنی اس نے عملاً اور دانستہ طور پر ان Ontological سوالات کا جواب دینے سے پہلو تہی کی ہے۔ ان سوالات کا جواب دینا ممکن ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فرد یا وجود کی حدود متعین ہیں آپ جو کچھ کرتے ہیں وہ اظہار ہے معاشرتی تعلقات کا جو کچھ ہو رہا ہے وہ تشکیل پاتا ہے۔ "The they" سے۔ یعنی آپ کی روزمرہ کی زندگی Every dayness اس کے مطابق آپ متعین ہوتے ہیں "The They" سے مراد روزمرہ زندگی ہے۔ جو کچھ دن بھر ہوتا رہتا ہے آپ کرتے رہتے ہیں، چلے جاتے ہیں، واپس آتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں۔ آپ کا طرز زندگی آپ کو مہلت نہیں دیتا کہ جو کچھ ہوتا رہتا ہے اس کے علاوہ کچھ اور ہونے کی جستجو کر سکیں۔ چنانچہ آپ کی شخصیت بہت بڑی حد تک اس سے متعین ہوتی ہے کہ the They آپ پر کس حد تک غالب آتا ہے۔

ہائیڈیگر اور Wittegenstein اور مابعد الطبیعاتی سوالات:

با معنی وجود (Authentic Existence) ایک خاص تصور ہے، "Existence"

اس کے مطابق اس وجودیت کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو Ontological سوالات پہ غور کرنا چاہیے ۔ وہ طرز زندگی آپ کو اختیار کرنا چاہیے جو آپ کو The They اور Fallenness کی Determinnation سے آزاد کرائے ، یہ Authentic Existence آپ اسی طریقے سے choose کر سکتے ہیں جب آپ اپنی موت کو سنجیدگی سے لیں ۔ Heideger کہتا ہے کہ آپ جو اکیلا کام صرف اپنے لیے کرتے ہیں [جہاں آپ کی Existence مکمل Realize ہوتی ہے] وہ آپ کی موت ہے ۔ آپ کی موت ہی میں وہ تخلیق ہے جو صرف آپ کرتے ہیں کوئی آپ کے لیے مر نہیں سکتا آپ خود مرتے ہیں ، اپنے لیے مرتے ہیں ۔ چنانچہ Authentic Existence وہ Existence ہے جس میں آپ موت کا سنجیدگی کے ساتھ سامنا کرتے ہیں اور موت کا Seriously سامنا کرکے ہی آپ اپنے آپ کو the They سے دنیا داری (Every Dayness) سے نجات دلا سکتے ہیں ۔ لیکن موت کا سنجیدگی سے کیسے سامنا کیا جائے ۔ موت کو با معنی کیسے بنایا جائے ۔ Heideger کے پاس کا کوئی جواب نہیں ۔ Heideger اس معاملے میں بالکل ویسے ہی خاموش ہے جس طریقے سے Wittengenstein اس بارے میں خاموش ہے کہ Value is out side the world, and how do you access the Value? Truth is out side the world and How do you access the truth?

اس سوال کا Wittengenstein کے پاس کوئی جواب نہیں اگر فی الواقع Authentic Existenz وہی ہے جو موت کو سنجیدگی سے سامنا کرے تو الٰہی علوم ، علوم لدنی اور معارف کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں جس کے ذریعے آپ با مقصد موت کا سامنا کر سکیں ۔ Heideger اور Wittgenstein کے یہاں یہ realization موجود ہے کہ مغربی تہذیب نے ان سوالات کو فراموش کر دیا ہے جن کا تعلق مابعد الطبیعاتی حقائق اور موت سے ہے ۔ مغربی تہذیب نے وہ تمام راہیں مسدود کر دیں ہیں جن کے ذریعے ان سوالات کا جواب حاصل کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن Heideger اور Wittgenstein کوئی نئی راہیں نہیں کھول سکے ۔ اقدار تک کیسے رسائی حاصل کی جائے ، موت کا سامنا کیسے کیا جائے ، اس کا جواب Wittgenstein کے پاس ہے نہ Heideger کے پاس ۔ زندگی کے معنی کہاں ملیں گے؟

اگر ہم Wittgenstein کی تعلیمات کا خلاصہ عرض کریں تو وہ یہ کہتا ہے کہ معنی کو موت میں تلاش کرنا ہے ۔ معنی کہاں ملیں گے ۔ انسان کو زندگی کی حقیقت کا کہاں ادراک ہوگا؟ موت میں ان معنوں میں Habermas اس کا انکار کرتا ہے وہ کہتا ہے زندگی کے معنی کا ادراک زندگی میں ہوگا ، موت میں نہیں ہوگا ۔ معنی زندہ رہنے اور زندگی گزارنے میں حاصل ہوں گے ۔[ہیبر ماس بیسویں صدی کا اہم فلسفی ہے جو موجودہ دور میں تنویری اقدار کا دفاع پیش کر رہا ہے ۔ موجودہ دور میں اس کی سطح کا کوئی فلسفی موجود نہیں ۔ پہلے یہ امریکہ میں تھا اب جرمنی واپس آ گیا ہے ۔ یورپین یونین کا Consultant

ہے۔Habermas کہتا ہے کہ معنی موت میں نہیں، زندگی میں ہیں اور Self انسانیت کا حصہ ہے۔ اور پوری انسانیت میں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسی دنیا میں ایک ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور یہ زندگی سب کو مل کر ساتھ گزارنا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر نفوس کے درمیان ہونے والا تبادلہ خیال (Inter Subjective communication) صحیح اصولوں کے مطابق مستقل ہوتا رہے (یعنی Discource میں بھی اور Practices میں بھی) تو اس کے نتیجے میں Experience کے معنی واضح ہو جائیں گے۔

ہیبر ماس کا فلسفہ کیا ہے؟

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہیبر ماس Hermenuetics اور Phenomenology وغیرہ سے متاثر ہے وہ کہتا ہے کہ Inter subjective communication کے ذریعے ہم اپنے تجربات کے ایسے معنی حاصل کر سکتے ہیں جو فی الواقع آفاقی معنی ہوں ہم ایسے حقائق کا ادراک کر سکتے ہیں جو فی الواقع آفاقی حقائق ہوں۔ اسی دنیا میں، اسی زندگی کو Share کر کے اور ایک دوسرے سے بلا روک ٹوک Communicate کر کے ان معنوں کا ادراک کر سکتے ہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ دنیا میں فی الواقع ایسا ہوتا نہیں ہے اور وہ کیوں نہیں ہوتا اس کی بہت سی وہ وجوہات بیان کرتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ کہتا ہے کہ سیاسی قوت اس وقت ایسی قوت ہے، جو اس طریقے سے مرتب ہے کہ Inter subjective communication کو ممکن نہیں ہونے دیتی تو اگر سچی جمہوریت (True Democracy) قائم کی جائے اور سچی جمہوریت سے اس کی مراد یہی ہے کہ Inter subjective communication کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں (بالخصوص میڈیا نے کھڑی کر رکھیں ہیں مثلاً جو کمیونیکیشن کو distort کرنا وغیرہ) ان کو ختم کر دیا جائے تو ہم Experiences کا تبادلہ کر کے meaning تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور meaning تک رسائی حاصل کرنے کے لیے True democracy، قائم کرنا ضروری ہے۔ایسی democracy جہاں کمیونیکیشن کو کسی خاص مقصد کے لیے استعمال نہ کیا جا رہا ہو۔ وہاں ہم صحیح معنی تک پہنچ سکتے ہیں۔

انسان خالق ہے اور خالق کائنات بھی، سارتر کا فلسفہ:

بیسویں صدی کا ایک اور مفکر کہ جس کا Existentialism میں سمجھتا ہوں بہت اہم مقام ہے وہ ہے سارتر۔ سارتر کے مطابق آزادی مطلق ہے اور کوئی بھی ایسے Choices نہیں ہیں کہ جو لازماً انسان کو اختیار کرنے پڑیں۔ آزادی مطلق ہے اور کوئی قطعی choice موجود نہیں۔ایسی کوئی بھی چیزیں نہیں جنہیں انسان چننے پر مجبور ہے۔ بلکہ آزادی absolute ہے۔ نفس یا ذات یا Self خود کوئی چیز نہیں ہے۔ Self کو Create کرنا پڑتا ہے یہاں سے بنیادی فرق پیدا ہوتا ہے کہ انسان خالق ہے۔ The self has to be created۔ Self خود اپنے آپ کو تخلیق کرتا ہے۔ اور Self دنیا کو ویسا بنا سکتا ہے جیسا وہ ہے۔ Self کے اندر اس کی استطاعت ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ اپنے آپ کو خود

تخلیق کرے بلکہ وہ دنیا کو بھی تخلیق کرے۔ وہ دنیا کو جس طریقے سے بھی چاہتا ہے تخلیق کر سکتا ہے اس لیے کہ کوئی بھی Choice قطعی اور ضروری نہیں ہے۔ آزادی تو مطلق ہے۔

انسان کا خدا نہ بننا Bad Faith ہے:

چنانچہ انسان خالق ہے اپنے آپ کا بھی اور کائنات کا بھی۔ وہ کائنات کو ویسا ہی بنا سکتا ہے جیسا وہ اس کو بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ جس چیز کی بنیادی طور پر انسان کوشش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدا بن جائے۔ Explicity سارتر کے ہاں یہ تصور موجود ہے [پوری تاریخ میں بین السطور اور سارتر صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ انسان کی اصلی خواہش یہی ہے کہ وہ خدا بن جائے۔ خدا کن معنوں میں بن جائے؟ ان معنوں میں کہ وہ جو چاہے اسے ممکن بنا دے۔] اور اگر آپ خدا نہیں بننا چاہتے تو یہی Bad Faith ہے۔ Bad faith یہ ہے کہ آپ خدا نہ بننا چاہیں۔ دوسری جگہ وہ کہتا ہے دوسرے کا وجود جہنم ہے (Hell is other people)۔ دوسرے کا وجود جہنم ہے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی خدا بننا چاہتے ہیں لہٰذا خدا بننے کا عمل کیا ہے۔ خدا بننے کا عمل یہ ہے کہ آپ جستجو اور جدوجہد کریں زیادہ سے زیادہ آزادی کے لیے اور تخلیقیت کے لیے اور زیادہ سے زیادہ اس کو ممکن بنانے کے لیے کہ جیسا آپ دنیا کو بنانا چاہتے ہیں اسے ویسا بنا دیں۔ یا آپ خود جیسا بننا چاہتے ہیں ویسا بن جائیں۔ لیکن سارتر کا ہی ایک ہم عصر اور اس کا ساتھی Camus کہتا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ آپ کی تخلیقیت کی ایک حد ہے اور وہ حد کیا ہے؟ وہ موت ہے۔ جس وقت آپ مر جاتے ہیں اس وقت کیا واضح ہوتا ہے۔ اس وقت یہ واضح ہوتا ہے زندگی ایک مہمل چیز ہے۔ زندگی بے معنی شے ہے تو فی الواقع زندگی ایک tregedy ہے۔ Tregedy ان معنوں میں ہے کہ کوشش آپ اس چیز کی کرتے ہیں جو چیز کبھی ممکن ہو نہیں سکتی۔ جس چیز کو آپ کبھی تخلیق کر نہیں سکتے۔ وہ ابدیت ہے۔ آپ بنیادی طور پر خدا بننا چاہتے ہیں تو خدا کی تو یہی خصوصیت ہے کہ نہ اس کی انتہا ہے، نہ ابتدا۔ انسان کی انتہا موت ہے لہٰذا خود تخلیقیت کے لیے انسان کی سعی وجدوجہد اور کائنات کی تخلیقیت کی کوشش فعل عبث ہے اس لیے کہ انسان کی موت یہ ثابت کرتی ہے کہ انسان محدود ہے اور انسان کی تخلیقیت اختتام پذیر ہے۔

فوکالٹ کا فلسفہ۔ آفاقی قوانین تخلیق نہیں کیے جا سکتے:

ایک دو اور فلسفیوں کا تذکرہ کروں گا لیکن بنیادی طور پر آخری فلسفی جس کا میں تذکرہ کروں گا وہ ہے Foucault۔ فوکالٹ کے دو استاد تھے اور دونوں ہی structuralist تھے۔ ایک Levi Strauss اور دوسرا Althuser۔ جو مارکسٹ تھا Levi Strauss materalist اور anthropologist تھا اور اس کا اثر فوکالٹ پر ہوا۔ حالانکہ فوکالٹ کا مقام Levi Strauss اور Althuser سے بلند ہے۔ فوکالٹ محض Structualist نہیں ہے بلکہ ایک آگے کی چیز ہے اس کی فکر میں زیادہ گہرائی ہے وہ مغربی تہذیب کے زیادہ آدرشوں کو جمع کرتا ہے۔ فوکالٹ بیسویں صدی کے

دوسرے آخر کا بہت اہم فلسفی ہے ۔چنانچہ گفتگو شروع کرتے ہیں اس سوال سے کہ ساختیت (Structuralism) کا بنیادی خیال کیا ہے؟ ۔ساختیت کا بنیادی خیال یہ ہے کہ انسانی تعلقات کے جو قوانین ہیں ان کا ادراک آپ زبانوں یا ثقافت کے تجزیے کے ذریعے کر سکتے ہیں ۔ثقافت اور زبان کے تجزیے کے ذریعے آپ یہ بھی جان سکتے ہیں کہ انسانوں کے رویوں کو متعین کرنے والے قوانین کون سے ہیں ۔اسی بنیادی خیال کی تجدید Modify کرکے فوکو نے مغربی تہذیب کا مطالعہ کیا ۔مغربی تہذیب کے جو کلیدی تصورات ہیں ان کا جائزہ لیا اور ان کی geneology دریافت کرنے کی کوشش کی ۔اس نے مغربی تہذیب کا مطالعہ کیا تا کہ وہ معلوم کر سکے کہ مغربی اقدار کی جو تاریخی جڑیں ہیں (Historical Root) وہ کیا ہیں ۔کہاں سے وہ تصورات نکلے ہیں جن تصورات کی بنیاد پر آج مغربی تہذیب اپنی توجیہہ (Justification) پیش کرتی ہے وہ تمام تفصیل بیان کرنے کا اس وقت موقع نہیں ۔ جو چیز ہمارے لیے ضروری ہے وہ یہ کہ اس علم کے ذریعے سے وہ اس نتیجے تک پہنچا کہ ایسے قوانین جو آفاقی ہوں وہ کسی خاص تہذیب کے مطالعے سے یا کسی خاص Ideology کو واضح کرنے سے نہیں نکلتے ۔

مغربی تہذیب کا اس نے جو مطالعہ کیا ۔مغربی تہذیب کا جو اس نے تجزیہ کیا اس نے اس کو اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ آفاقی قوانین کو derive نہیں کیا جا سکتا ۔

مغربی تہذیب انسان کی موت کا اعلان کرتی ہے:

فوکالٹ کہتا ہے کہ ان معنوں میں مغربی تہذیب کا المیہ یہ ہے کہ یہ صرف خدا کی موت کا اعلان نہیں کرتی (جیسے کہ نطشے نے کہا تھا کہ خدا مر گیا) بلکہ یہ تہذیب تو انسان کی موت کا بھی اعلان کرتی ہے ۔خدا مر گیا ان معنوں میں کہ اب will to power کے نتیجے میں ہم اپنی بقاء کو ensure کر سکتے ہیں ۔اور ہمیں کسی خدا کی ضرورت نہیں کہ زندگی کیسے بسر کی جائے تا کہ ہمیں ابدی زندگی ملے نہیں ۔ will to power کے ذریعے ہم خود Survive کر سکتے ہیں ۔فوکو کہتا ہے کہ یہ صرف خدا کی موت نہیں بلکہ انسان کی بھی موت ہے (This is not only the death of God but also the death of man) ۔انسان کی موت کیا ہے؟ ہم اپنے تجربات کے حوالے سے آفاقی قوانین نہیں شناخت کر سکتے جس کی بنیاد پر ہم کہہ سکیں کہ انسانیت کے زندگی گزارنے کا جو طریقہ ہے وہ یہ طریقہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ علم معاشرتی بنیادوں پر تشکیل کردہ ہے اور علم کو جو لوگ معاشرتی بنیادوں پر تشکیل دیتے ہیں ان کا اس کے پیچھے ایک خاص مقصد ہوتا ہے وہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ایک خاص معاشرے کے اندر وہ غالب رہیں ۔

مغربی تہذیب کا بنیادی مقصد دنیا پر غلبہ ہے:

فوکالٹ کے یہاں علم اور قوت ایک ہی چیز ہے ۔وہ علم اور قوت کے درمیان ایک لکیر کھینچتا ہے ۔ جب بھی وہ علم اور قوت لکھتا ہے تو لکھتا ہے قوت/علم (Knowlge/Power) ۔علم اور قوت ایک

ہی چیز ہے۔علم بھی اسی لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ان معنوں میں وہ Nietzshean ہے چوں کہ اس کے نزدیک بھی اصل چیز بقاء ہے۔اصل چیز زندہ رہنا ہے، اصل چیز بالادستی قائم کرنا ہے حق کی تلاش اصل نہیں ہے۔چنانچہ مغربی تہذیب کے بنیادی آدرش مغربی تہذیب کی بنیادی اقدار مغربی تہذیب کو غالب کرنے کے سوا کچھ نہیں۔فوکو کہتا ہے کہ مغربی فکر کے بنیادی تصورات بنیادی طور پر مغرب کے غلبہ کے ذرائع ہیں اور گو کہ وہ ان اقدار کو حق سمجھتا ہے۔یعنی فوکو کے ہاں آزادی کی کوئی نفی نہیں۔(آزادی وہ واحد تصور ہے جس پر مغرب کا ہر مفکر متفق ہے) آزادی قدر مشترک ہے جو مغربی تہذیب کی بنیادی خصوصیت ہے وہاں آزادی پر یقین ہے ایمان ہے۔آزادی پر ایمان انسان پر ایمان کے مماثل ہے یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان قائم بالذات ہے۔اسی لیے مغربی تہذیب کا بنیادی کلمہ ہے لاالہ الاالانسان۔ اس کو کہیں زور سے کہا گیا ہے کہیں کم زور سے کہا گیا ہے۔اہلِ مغرب کم ازکم علمی بنیادوں پر آزادی کی قدر پر متفق ہیں۔فوکو بھی متفق ہے۔فوکو کے ہاں اس کی realization اس کا اقرار کہ مغرب کی اقدار کا فروغ غلبے کا ہی ذریعہ ہے اور ان کی کوئی آفاقی حیثیت نہیں وغیرہ۔اس کے نتیجے میں وہ یہ فیصلہ نہیں کرتا کہ یہ اقدار رد کیے جائیں ایسا نہیں ہے وہ یہ کہتا ہے کہ انسان اس چیز کی مستقل کوشش کرتا ہے کہ اپنی خود ارادیت کو برقرار رکھ سکے وہ غلبہ کے خلاف ہمیشہ جدوجہد کرتا ہے لیکن اس کو یہ خود ارادیت کس چیز نے بخشی ہے، سرمایہ داری نے۔کیپٹل کو ناگزیر inevitable سمجھتا ہے۔بیسویں صدی کے بڑے مفکرین میں اکثریت ان فلسفیوں کی ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کو آزادی کے حصول کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔فوکو سارتر ہیبر ماس کے یہاں سرمایہ دارانہ نظام کو transcend کرنا ان کے ایجنڈا میں کسی نہ کسی شکل میں شامل رہتا ہے۔(حقیقت میں عملاً یہ ناممکن ہے لیکن in principle موجود ہے)۔فوکو کے ہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ سرمایہ دارانہ داخلیت ہی وہ داخلیت ہے کہ جس نے ہمیں آزادی عطا کی۔چنانچہ غلبے کو ختم کرنے کی ہماری جدوجہد دراصل مخصوص غلبہ کو ختم کرنے کی جدوجہد ہے۔

یہ جدوجہد سرمائے کی داخلیت کو ختم کرنے کی جدوجہد نہیں ہے۔ہم اس پہ مطمئن ہیں کہ ہم capital کے بندے ہیں [God] خدا کے بندے نہیں ہیں۔اس پر فوکو بالکل مطمئن ہے اور اس کے ہاں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جیسے کہ سارتر کے ہاں موجود ہے جیسے Camus کے ہاں موجود ہے۔وہ کہتا ہے کہ ہمیں ہمیشہ تجربے کرتے رہنا چاہیے۔تا کہ Domination کم ہو۔اور Capitalist Subjectivity، internalize ہو۔ہم خود subject of Capital نہیں۔ہمیں capital کے subject بننے کے اوپر مجبور نہ کیا جاسکے۔چنانچہ سرمایہ داری میں Struggle کی جگہ موجود ہے

لیکن یہ جدوجہد ایسی جدوجہد نہیں ہونی چاہیے جس کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ subjectivity خطرے میں پڑ جائے۔ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ struggle ایسی ہونی چاہیے جو محض مخصوص domination کو کم کرسکے۔اور capitalist subjectfication جو ہے وہ

internalize ہوجائے ۔انسان خوشی سے سرمائے کی داخلیت کو خود قبول کرلے۔

Derrida کا فلسفہ کیا ہے؟

آخری آدمی جس کے بارے میں کچھ عرض کروں گا وہ Derrida ہے اس کی بھی ساختیت (Structuralism) میں اہمیت ہے ۔وہ کہتا ہے کہ تمام struggle وغیرہ بے معنی ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں ۔اصل میں subject تو ہے ہی نہیں ۔انسان تو موجود ہی نہیں ۔صرف تعلقات ہیں ان کے آپ کتنے بھی Analysis کرلیں آپ کو یہ پتا چلتا ہے کہ ایک خاص power structrue کو sustain کرنے والے ہیں لہٰذا آپ تو محض deconstruct کرسکتے ہیں ۔نہ کوئی subject ہے نہ کوئی author ہے کچھ بھی نہیں ہے صرف تعلقات کا ایک تانابانا ہے ۔اس کو آپ جب دیکھتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ قوت کیسے مرتکز ہورہی ہے ۔آپ کو ہر چیز کی اصل حقیقت کو بیان کردینا ہے اور وہ کیسے بیان کرسکتے ہیں [through a power of deconstruction]۔ Derrida کی رائے کے نتیجے میں کوئی مثبت خیال اس کے ہاں سے نہیں نکلتا ۔لیکن مغربی تہذیب کے مختلف آدرشوں کی جو inconsistencies ہیں ان inconsistencies کو بیان کرنے کے لیے Derrida کا جو discourse وہ کسی نہ کسی حد تک اہمیت کا حامل ہے ۔ ہمارے لیے یہ ضروری بات ہے کہ ہم اسلامی الٰہیات اور اسلامی تصورات ontology کے سوالات کو بنیاد بنا کر اسی طریقے سے کہ جس پر ہمارا اجماع ہے ان مغربی مفکرین کا اسلامی محاکمہ پیش کریں ۔کانٹ ،ہیگل ،مارکس نطشے ،فرائڈ ،وٹگنسٹائن ،ہیبر ماس ،ہائی ڈگر اور فو کو۔جب ہم یہ کام کرنا شروع کریں گے اس وقت ہم مغربی تہذیب کی اصلیت اور روحانیت کا ادراک حاصل کرسکیں گے ۔مغربی تہذیب ایک باطل تہذیب ہے اور مغربی تہذیب سے کسی مصالحت کا سوال پیدا نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے اعتقادات حق ،خیر ،آخرت کی نفی پر مشتمل ہیں اور یہ خالص کفر ہیں انسان کے بارے میں ،کائنات کے بارے میں ۔تصور خیر کے بارے میں تصور حق کے بارے میں ۔یہ انکار شرک سے بھی آگے کی ایک منزل ہے ۔مغرب اور مذاہب عالم اور خصوصا اسلام کے مابین بنیادی نوعیت کے علمیاتی اختلافات ہیں لہذا مغرب و شرق کے درمیان مصالحت و مکالمے کی کوشش ایک غیر فطری کوشش نظر آتی ہے۔

تیسرا باب

فلسفہ جمہوریت کا محاکمہ

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

اس باب کا موضوع جمہوریت ہے۔میں یہ کوشش کروں گا کہ جمہوریت کی اصلیت، اس کی ماہیت اور اس کی حیثیت وحقیقت اور موجودہ زمانے میں اس کے کردار کے حوالے سے چند گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کروں اور اس ضمن میں اس حکمتِ عملی کا بھی تذکرہ کروں جس کو اپنا کر عالمی سطح پر بھی اور ملکی سطح پر بھی ایک جمہوری معاشرہ اور جمہوری ریاست قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

بنیادی طور پر جو فکر، عمل، عقیدہ اور نظریہ آج پوری دنیا میں غالب ہے اسے ہم سرمایہ داری کہہ سکتے ہیں۔یہ فکر اور نظام انسان کو خدا کے بندے کی بجائے حرص اور حسد کا بندہ بناتا ہے اسی کو ہم کہتے ہیں (Transforming the subject of God into subject of Capital.) (خدا کے بندے کو سرمایہ کے بندے میں تبدیل کردینا) جو نظام اس وقت غالب ہے وہ سرمائے کا نظام ہے اور سرمائے سے مراد محض حرص وحسد ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔سرمائے کی حیثیت صرف یہ ہے کہ قلوب کو حرص اور حسد مسخر کرلیں۔یہ کیفیت صرف امیر آدمی پر طاری نہیں ہوتی۔کوئی وجہ نہیں ہے کہ تاجر اور صنعتکار کو صرف حرص وحسد مسخر کریں مزدور کو بھی مسخر کرسکتے ہیں۔ایک یونیورسٹی میں پڑھانے والے کو بھی حرص وحسد مسخر کرسکتے ہیں۔لہٰذا حرص وحسد کی یہ کیفیت جس شخص اور جس معاشرے پر غالب ہو وہ شخصیت سرمایہ دارانہ شخصیت اور وہ معاشرہ سرمایہ دارانہ معاشرہ ہے خواہ نظریاتی طور پر وہ معاشرہ کتنے ہی دعوے کرے لہٰذا سرمایہ داری دراصل کسی بھی معاشرے میں حرص وحسد کے جذبات خبیثہ کے عام ہوجانے کی کیفیت کا نام ہے۔ان معنوں میں سرمایہ داری ایک عمومی تصور ہے۔جس میں ہر وہ شخص شامل ہوتا ہے جس کے قلب پر حرص وحسد کا قبضہ ہوجائے تو ان معنوں میں سرمایہ دارانہ نظام سے ہماری مراد وہ نظام ہے کہ جہاں کا تعقل اور جہاں کی ترتیب اعمال اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ حرص وحسد کو ایک منظم انداز (Systematically) میں فروغ حاصل ہو۔

جمہوریت سرمایہ داری کے غلبے کی تنظیم:

اس سرمایہ دارانہ نظام کی سیاسی اور معاشرتی تنظیم کو ہم جمہوریت کہتے ہیں۔جمہوریت سرمایہ داروں کے غلبے کا آلہ کار ہے۔جمہوریت کا آپ کوئی دوسرا نام رکھنا چاہیں تو رکھ لیں لیکن تاریخی طور پر

جس چیز کو جمہوریت کہا گیا اور جو بحیثیت جمہوریت کے غالب آئی ہے یہی چیز ہے جو میں عرض کر رہا ہوں ۔معاشرے اور ریاست کی وہ صف بندی جس کے نتیجے میں سرمایے کا غلبہ ممکن ہوسکے، سرمایے کا غلبہ عام ہوسکے تاریخی طور پر ہم اس کو جمہوریت کہتے ہیں ۔اور مغربی تناظر میں اگر ہم جمہوریت کے فروغ اور ارتقاء کی کوئی تاریخ لکھیں اور کوئی ہم سے پوچھے کہ جمہوریت کیا چیز ہے؟ تو ہم یہی عرض کریں گے کہ جمہوریت وہ معاشرتی اور ریاستی صف بندی ہے جس کے نتیجے میں سرمائے کی بالا دستی اور سرمائے کا غلبہ انفرادی زندگی پر بھی اور معاشرے اور ریاست پر بھی مسلط ہوجاتا ہے اور مستحکم کیا جاتا ہے ۔جمہوریت کا مقصد سرمائے کے غلبے کو مستحکم کرنا ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں ۔جمہوریت کی تعریف اگر تاریخی طور پر کی جائے تو اس طریقے سے کی جاسکتی ہے کہ جمہوریت وہ نظام، وہ معاشرتی وسیاسی حکمتِ عملی ہے جس کے نتیجے میں سرمائے کے غلبے کو بحیثیت مجموعی انفرادی سطح پر، منظم ومربوط طریقے سے معاشرے کی سطح پر اور ریاست کی سطح پر قائم کیا جاتا ہے ۔

جمہوریت میں فرد کی اخلاقی حیثیت سے کوئی بحث نہیں:

جمہوریت جس بنیادی مفروضے کے اوپر قائم ہے وہ یہ ہے کہ تمام افراد برابر ہیں ۔ہر فرد دوسرے فرد کے برابر ہے ان معنوں میں کہ اس نے جس طریقے سے بھی اپنے نفس میں خواہشات کا پیمانہ مرتب کیا ہے ۔وہ اس کی اس حیثیت پر اثر انداز نہیں ہوتی کہ وہ معاشرے میں کیا مقام رکھتا ہے یا ریاست میں کیا مقام رکھتا ہے ۔وہ شخص جو عابد وزاہد ہے جس کی زندگی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق، اور خواہشات کے مطابق مرتب ہوتی ہے اور وہ شخص کہ جس نے اپنے نفس کو شیطان کے سپرد کردیا ہے اور جس کے نزدیک زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کرنا زندگی کا مقصد ہے ۔ریاست اور معاشرے کی سطح میں دونوں برابر ہیں یکساں اہمیت کے حامل ہیں ۔آزادی کے اسی تصور (Equal Freedom) پر جمہوریت کی بنیاد ہے ۔ایک فرد کے اپنے نفس کے اندر جو بھی خواہشات، میلانات اور جذبات ہیں ۔ان کی ترتیب کس نوعیت کی ہو اس سے معاشرتی عدل اور ریاستی عمل کے تعین کا کوئی تعلق نہیں ۔اور معاشرتی عدل و تنظیم اور ریاستی تنظیم میں اس کو دوسرے فرد کے برابر سمجھا جائے گا اس چیز سے آنکھیں بند کر کے کہ اس کی اپنی اخلاقی زندگی (Moral Life)، اس کی اپنی تعین اقدار کیا ہے؟ ان معنوں میں آپ ہر دوسرے شخص کے برابر ہیں ۔ایک زانی اور شرابی، ایک نمازی اور پرہیز گار کے برابر ہے ۔اسی طریقے سے ان کا ایک ووٹ ہے اسی طریقے سے وہ سرمایہ دارانہ معاہدے (Contract) کا شریک حصہ دار ہوسکتا ہے جس طریقے سے دوسرا شخص ۔تو جمہوریت کی بنیاد یہ ہے ہم اس بات کو نظر انداز کرتے ہیں کہ لوگوں کی اخلاقی اور روحانی حالت اور کیفیت کیا ہے؟ ان کی روحانی اور اخلاقی کیفیت اور حالت کچھ بھی ہو معاشرے اور ریاستی نظام میں ان کا مقام یکساں ہے اسے ہم کہتے ہیں مساوی آزادی (Equal Freedom) ۔ان معنوں میں مساوات (Equality) اور آزادی (Freedom) بالکل لازم وملزوم ہیں ۔

اسلامی معاشرتی درجہ بندی کیا ہے؟

ناممکن ہے کہ ہم ایک ایسا نظام تعمیر کریں جو عبادت الٰہی کی بنیاد پر قائم ہو اور اس کے اندر ہم مساوات کو شامل کرلیں ۔لازماً اگر ہم نے ایک ایسا نظام قائم کیا کہ جس کے اندر عبادت مقصود ہے اور عبادت کو منتقل کرنے کے لیے ہم اپنے معاشرے اور ریاست کی صف بندی کررہے ہیں تو لازماً ہمیں اسلامی درجہ بندی کو قبول کرنا ہوگا ۔اسلامی معاشرتی درجہ بندی کو قبول کرنا ہوگا ۔میں چونکہ ایک جاہل آدمی ہوں اس لیے اس کی تفصیل نہیں بیان کرسکتا لیکن اسلامی معاشرہ وہ ہوگا جہاں اہل تقویٰ ،اہل رائے اور اللہ والے قیادت کا منصب اختیار کریں گے اور باقی ان کے تابع ہوں گے وہ مزکی اور مربی ہوں گے اور باقی حضرات کی تربیت فرمائیں گے ۔اسلامی صف بندی جو ہوتی ہے وہ اسی درجہ بندی کی بنیاد پر ہوتی ہے ۔جہاں ہم لوگوں کے نفس کی کیفیت کی بنیاد پر ان کو ذمہ داریاں سپرد کرتے ہیں ۔معاشرتی سطح پر بھی اور ریاستی سطح پر بھی ۔جمہوریت اس معاشرتی درجہ بندی کی نفی ہے ۔اس درجہ بندی کی نفی ہے معاشرتی سطح پر بھی اور ریاستی سطح پر بھی ۔وہ کہتی ہے نہیں سب برابر ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک شخص کی نفسی کیفیت کیا ہے اس کا حال کیا ہے اس کا مقام کیا ہے اس کی روحانی وسعت کیا ہے؟ اس کی علوم لدنی تک کتنی رسائی ہے ۔اللہ کی مرضی کا کتنا تابع ہے ۔یہ سب بے کار باتیں ہیں ۔اس کا معاشرتی اور ریاستی عمل سے کوئی تعلق نہیں اسی لیے ہر جمہوری نظام میں جو بنیادی چیز ہوتی ہے وہ ہوتی ہے دستور۔

جمہوری ریاست میں دستور کتاب اللہ کا متبادل بن جاتا ہے:

دستور ہی کے ذریعہ یہ مساوی آزادی مرتب کی جاتی ہے اور دستور اصل میں کتاب اللہ کی جگہ لیتا ہے ۔سب سے پہلا دستور جو بنا وہ امریکہ ہی کا دستور تھا ۔1780ء کے دوران میں فیڈرلسٹ پیپر (Federalist Paper) اور اس کے بعد دستور بنا اس نے فی الواقع صریحاً انجیل کی جگہ لی دنیا بھر میں جہاں جہاں جمہوریت قائم ہوئی خواہ وہ مذہبی ریاستیں تھیں یا اسلامی حکومتیں ان سب نے دستور کی بالادستی قبول کی اور عملاً ان تمام اسلامی و نظریاتی ریاستوں میں دستور نے کتاب اللہ کی جگہ لے لی ۔اصل میں دستور کی اہمیت کیوں ہے اس لیے کہ دستور ہی کے ذریعے یہ مساوی آزادی (Equal Freedom) ممکن بنائی جاتی ہے ۔لیکن مساوی آزادی کے تصور کو سمجھنا نہایت اہم ہے اور مساوی آزادی کے تصور کو رد کیے بغیر احیاء اسلامی کا کام معاشرتی اور ریاستی سطح پر منظم کرنا ناممکن ہے۔

جمہوری معاشرے میں تعلقات کی بنیاد غرض ہے:

اب میں جمہوری معاشرے اور جمہوری ریاست کے بارے میں چند باتیں عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں ۔جمہوری معاشرہ ہم اس معاشرے کو کہہ سکتے ہیں جہاں وہ صفات عام ہوں جن کے نتیجے میں سرمائے کے ارتکاز کو اور سرمائے کی بڑھوتری کو تقویت ملے جمہوری معاشرہ وہ معاشرہ ہے جہاں تمام تعلقات کی بنیاد غرض پر ہوتی ہے ۔ان معنوں میں جمہوری معاشرے کو سول سوسائٹی کہتے ہیں اور سول

سوسائٹی مذہبی معاشرہ کی نفی ہے۔سول سوسائٹی جب یورپ میں وجود پذیر ہوئی تو اس نے مذہبی معاشرہ کو ختم کیا۔عیسائی معاشرت کو ختم کیا اور عیسائی معاشرت اور سول سوسائٹی میں کیا بنیادی فرق تھا یہ بنیادی فرق تھا کہ عیسائی سوسائٹی محبت اور صلہ رحمی پہ قائم تھی۔ جب کہ سول سوسائٹی معاہدے، فائدے، حرص و حسد اور غرض کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔

سول سوسائٹی اور مذہبی معاشرے کا فرق:

lineage جسے ہم صلہ رحمی کہتے ہیں عیسائی معاشرت صلہ رحمی اور محبت پہ قائم تھی اور عیسائی معاشرے یا مذہبی معاشرے کی جو بنیادی صف بندی ہوتی ہے وہ صلہ رحمی ہی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔محبت کی بنیاد پر ہوتی ہے انفاق کی بنیاد پر ہوتی ہے قربانی دینے کی بنیاد پر ہوتی ہے اس کے برعکس جمہوری سوسائٹی یا سول سوسائٹی کی بنیاد کنٹریکٹ ہوتی ہے۔کنٹریکٹ سے مراد یہ ہے کہ آپ اپنے خاص مقاصد کو جو کچھ بھی آپ نے مقاصد اپنے لیے متعین کیے ہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے دوسرے کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کریں جس کے نتیجے میں وہ آپ کو ان مقاصد کے حصول میں مدد دے۔چناں چہ آپ اس سے محبت نہیں کرتے بلکہ آپ کی ایک باہمی غرض ہوتی ہے ایک غرض آپ کی ہوتی ہے اس کی بھی ایک غرض ہوتی ہے اور ان دونوں اغراض کو حاصل کرنے کے لیے آپ ایک محدود تعاون کرتے ہیں اس تعاون کے نتیجے میں آپ ایک دوسرے کو استعمال کر کے اپنی ذاتی اغراض کو حاصل کرتے ہیں۔پورا معاشرہ اسی خود غرضانہ تعاون کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔مارکیٹ ایک استعماری مظہر ہے۔کیونکہ وہ ہر تعلق کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اور بنیادی طور پر سول سوسائٹی مارکیٹ سوسائٹی ہی ہوتی ہے اور سول سوسائٹی کے اندر خود غرضانہ تعاون و معاہدے اور اغراض کی جستجو کے سوا کوئی دوسرا کام کرنے کی وقعت نہیں رہتی۔اضافی قدر (relative value) کا تعین اسی بنیاد پر ہوتا ہے کہ آپ اپنے معاہدے کو کتنا پورا کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور کتنا پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ریاست کا بھی یہی ایک بنیادی فریضہ ہوتا ہے کہ معاہدوں کا نفاذ (Enforcement of Contracts) کرے۔ ریاست بھی ظاہر ہے ایک جمہوری ریاست ہوتی ہے۔جمہوری ریاست کا جمہوری معاشرے سے گہرا تعلق ہے۔

جمہوری معاشرے اور مذہبی معاشرے کا فرق:

جمہوری معاشرہ جمہوری ریاست کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔یہاں جو سمجھنے کی بات ہے جو میں گزارش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جمہوری معاشرے اور مذہبی معاشرے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جمہوری معاشرے میں تعلقات کی بنیاد غرض اور اس کی تکمیل ہوتی ہے۔مذہبی معاشرے میں تعلقات کی بنیاد صلہ رحمی اور محبت پر ہوتی ہے۔مذہبی معاشرے کی خصوصیت یہ ہے کہ غیر کو اپنایا جاتا ہے۔یہی محبت ہے۔صلہ رحمی ہے غیر کو اپنانا۔سول سوسائٹی میں بقول سارتر کے Hell is other people، غیر غیر ہی رہتا ہے اپنے کچھ خاص مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے۔

سرمایہ دارانہ معاشرے نے کیا اقدار دیں:

جب یورپ میں اس قسم کا معاشرہ قائم ہوا اٹھارویں صدی سے یہ عمل شروع ہوا۔اس وقت جو معاشرہ تھا جس کا میں تذکرہ کر رہا ہوں غرض کی بنیاد پر قائم شدہ معاشرہ۔ یہ صرف چند شہروں میں تھا۔نیپلز میں،فلارنس میں اور اٹلی کے کچھ شہروں میں۔سوئٹزرلینڈ میں کہیں کہیں بحیثیت مجموعی جو یورپین معاشرہ تھا وہ عیسائیت کے زیراثر تھا۔سرمایہ دارانہ معاشرہ(سول سوسائٹی) بہت دھیرے دھیرے پھیلا۔اس کے نتیجے میں بڑے بڑے شہر بنے اور پھر اس کے بعد ملک بنے اور پھر اس کے بعد یورپ میں بحیثیت مجموعی اور پھر اس کے بعد یورپ کی نوآبادیات میں یہ معاشرہ پھیل گیا تو ہم یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں کون سے اخلاق نے فروغ پایا۔کن اوصاف نے فروغ پایا ہے؟ یہ معاشرہ، جب آپ نے مذہبی معاشرے کو تبدیل کر کے ایک سول معاشرہ بنا دیا تو اس کے نتیجے میں کن اخلاق نے فروغ پایا؟ تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جس اخلاق نے فروغ پایا وہ حرص وحسد اور شہوت وغضب کے جذبات تھے کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا ہے کہ عملاً جن اقدار نے فروغ پایا اس تبدیلی کے بعد وہ اقدار رذیلہ تھے،اور وہ حرص وحسد اور طمع اور شہوت وغضب اور فرعونیت اور خود غرضی ہی تھے اور کچھ اور نہیں تھے یہی یورپ کی تاریخ ہے اور آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ اگر ان بنیادوں پر آپ نے دوسرے ممالک میں معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کی تو اس جنسی بے راہ روی،اس اخلاقی پس ماندگی اس زبوں حالی اس نفس کی غلاظت وکثافت کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ آپ برآمد کر پائیں گے۔اس کی کیا کوئی دلیل ہے،کوئی منطق ہے جو یہ کہہ سکے کہ یورپ میں جو ہوا وہ ہمارے ہاں نہیں ہوگا۔ہم اپنے ہاں ایک سول سوسائٹی قائم کر دیں گے لیکن اس سول سوسائٹی کے قیام کے نتیجے میں اولیاء اللہ کی بہتات ہوگی۔اس کی نہ کوئی تاریخی حیثیت ہے اور نہ منطقی۔ ظاہر ہے کہ وہی اخلاق پیدا ہوئے جن اخلاق کا پیدا ہونا اور غالب آنا سرمائے کی بڑھوتری کے لیے ضروری تھا سرمائے کی بڑھوتری اور حرص وحسد کا فروغ پانا ایک چیز کے دو نام ہیں کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ سرمایہ نام ہی اس کا ہے کہ حرص وحسد فروغ پائیں اور سرمایہ قلب کو مسخر کرے۔سرمایہ یہی چیز ہے اس کے علاوہ سرمایہ کچھ نہیں اس کی کوئی حقیقت اور حیثیت نہیں ہے۔

سرمائے کی اصل حیثیت۔اخلاقی گراوٹ:

آپ جانتے ہیں کہ اس وقت سرمائے کی جو شکل ہے وہ Finance ہے اور Finance کی کوئی حیثیت نہیں محض کمپیوٹر کی Memory کے اندر کچھ نکات (Dots) ہیں اس کی اصلی حقیقت وہی ہے کہ وہ حرص وحسد ہے ظاہر ہے کہ جس وقت آپ اپنی مجموعی کاوش کا مقصد حرص وحسد کی عمومیت قرار دیں تو معاشرے میں جو اخلاق فروغ پائیں گے وہ یہی اخلاق فروغ پائیں گے۔اور آپ جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں یہ کوئی قیاسی بات نہیں ہے۔ایسی چیز ہے کہ جن معاشروں نے اپنے آپ کو سرمایہ داری اور اور سرمایہ داروں اور استعمار کے سپرد کر دیا وہاں وہ تمام اخلاق رذیلہ اور وہاں وہ تمام خباثتیں پیدا ہو گئیں۔جنسی بے راہ روی،حرص وحسد اور طمع خود غرضی وغیرہ وغیرہ کہ جو یورپ میں

اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں پیدا ہوئیں تمام نوآبادیات میں پیدا ہوئیں آج آپ دیکھیں تھائی لینڈ، فلپائن اور ہندوستان میں ایڈز کی وبا ہے یہ کس وجہ سے آئی؟ اس وجہ سے آئی کہ انہوں نے اپنے آپ کو سرمایہ داری اور استعمار کے سپرد کر دیا۔ جو بھی ملک اور معاشرہ اپنے آپ کو سرمائے کے سپرد کرے گا اس کے اندر معاشرتی سطح پر اخلاقی گراوٹ آنا لازم ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ برآمد ہو۔ لہٰذا سول سوسائٹی کو جواز فراہم کرنے کی کوشش کرنا اور بڑی سادگی سے یہ کہنا کہ نہیں سول سوسائٹی کے اندر انسان کو بہت سے حقوق ملتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور اس کی اسلام میں اجازت ہے۔ مغربی فکر، فلسفے، تاریخ معاشروں سے ناواقفیت پر مبنی نقطہ نظر ہے۔ ایسا نقطہ نظر اختیار کرنا فی الواقع سول سوسائٹی کے قیام کے نتیجے میں معاشرے پر اور افراد کی ذاتی زندگی پر جو اثرات ہوتے ہیں ان سے سہو نظر کرنا ہے اور اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ ہم سول سوسائٹی کے قیام کے قائل نہیں ہیں بلکہ یقیناً ہم سول سوسائٹی کو تاریخی گمراہی اور طاغوت سمجھتے ہیں اور کوشش کریں گے اس بات کی کہ اسلامی معاشرتی اور ریاستی صف بندی ہو جس میں اہلِ تقویٰ اور اہل اللہ کی سیادت کو مستحکم کیا جائے اور اہل اللہ اور اہلِ تقویٰ کی سیادت کو معاشرے اور ریاست کی ہر سطح پر تسلیم کیا جائے اس کو قائم کرنا اخلاقِ حمیدہ کے فروغ کے لیے لازم ہے۔ اگر سیادت اور قیادت علمائے کرام اور صوفیائے عظام کے ہاتھ سے نکل کر کسی دوسرے طبقے کے ہاتھ میں چلی گئی تو یہ ظلم ہوگا، معاشرے کے ساتھ، ریاست کے ساتھ، فرد کے ساتھ ظلم ہوگا۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ معاشرے اور ریاست کی ہر سطح پر قیادت کا منصب صرف علماء کا منصب ہے اس لیے کہ جب علماء کو اس سیادت و قیادت سے محروم کیا گیا اور سیادت و قیادت دوسرے افراد کے ہاتھ میں دی گئی تو اس کے نتیجے میں معاشرے میں جو چیز پھیلی وہ اخلاقِ رذیلہ اور منکرات تھے۔ لہٰذا سول سوسائٹی کو رد کرنا اور اس معاشرتی صف بندی کو رد کرنا جو جمہوری نظام کا خاصہ ہے۔ آج سول سوسائٹی کو قائم کرنے کے لیے جو کوشش نظر آتی ہیں ان کا بھی میں اختصار کے ساتھ تذکرہ کر دوں۔

سول سوسائٹی اور این جی اوز:

سول سوسائٹی کو قائم کرنے کے لیے جو بنیادی ایجنسی آج کی دنیا میں موجود ہے اسے NGOs کہتے ہیں اس NGO کی تحریک کے پیچھے استعمار کا ہاتھ ہے NGOs کے مقاصد بنیادی طور پر معاشرے کو غرض (Interest) کی بنیاد پر تقسیم کرنا ہے۔ صلہ رحمی کی بنیاد پر جو فطری صف بندی معاشرے میں موجود ہے اس کو ختم کر کے غرض کی بنیاد پر سوسائٹی کو دوبارہ منظم کرنا تاکہ انسان بنیادی طور پر کسی خاص غرض کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھے۔ اور اس کے نتیجے میں معاشرتی سطح پر جو تحریکات یا Movements اٹھتی ہیں انہیں ہم کہتے ہیں Foucauldian Movements۔

Foucauldian تحریکیں یا سنگل ایشو موومنٹس:

Foucauldian Movements کیوں؟ اسلیے کہ فوکالٹ کہتا تھا کہ سرمایہ دارانہ

شخصیت (Subjectivity) آزادی کے حصول کا ذریعہ ہے لیکن سرمایہ دارانہ شخصیت (Subjectivity) کا اپنے آپ کو سرمایہ کے سپرد کردینے کا عمل اس چیز کا متقاضی ہے کہ آپ متعین غلبہ (Specific dominations) کو رد (resist) کرتے رہیں۔ آپ خالص کسی ایک معاملے (Issue) کو لے کر اپنی آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد (Struggle) کرتے رہیں کسی ایک مسئلہ پر مثلاً پانی نہیں آرہا تمام لوگوں کو اس بات پر متحد کیا جائے کہ پانی لاؤ تعلیم نہیں مل رہی تمام افراد کو اس چیز پر متحد کیا جائے کہ تعلیم حاصل کی جائے کوئی بھی single Issue Movement بغیر اس پورے خاکے کو چیلنج کیے بغیر، کہ تعلیم حاصل کرکے اور پانی کا حصول ممکن بنا کے تم بحیثیت مجموعی کس نظام کا غلبہ چاہتے ہو؟ اس بڑے سوال کو اٹھائے بغیر ان Single Issue Movements کے ذریعے حصولِ عدل کو سرمایہ دارانہ نظام سے ہم آہنگ کیا جا سکے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں وہ وسعت موجود ہے جس کے نتیجے میں ہم ان سنگل اشوز کا حل اس طریقے سے حاصل کر سکتے ہیں جس کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ حکمتِ عملی بحیثیت مجموعی مستحکم ہو۔ اسے ہم کہتے ہیں Foucauldian تحریک۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں لیکن جو بات اچھے طریقے سے سمجھ لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ غیر حکومتی تنظیمیں (NGO's) استعمار کی وہ ایجنسیاں ہیں جس کے نتیجے میں لوگوں کی خودغرضیوں کو بنیاد بنا کر سرمایہ دارانہ نظام کو قبول کرنے کی صلاحیت ان میں پیدا کی جا رہی ہے۔ ان خودغرضیوں کی جدوجہد اور ان خودغرضیوں کے حصول کے لیے جو تگ و دو وہ کرتے ہیں اس کا حصول عدل کے ذریعے کے طور پر معاشرتی سطح پر جواز (Legitimize) پیش کیا جاتا ہے۔ اس کو قبول کیا جائے کہ بنیادی طور پر سنگل اشو Movements پانی لانے کی تحریک یا تعلیم کو عام کرنے کی تحریک یا عورتوں کو آزاد کرنے کی تحریک، یہ وہ تحریکات ہیں جن کے نتیجے میں فی الواقع لوگ آزاد ہو جاتے ہیں ان کو اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ اس کے نتیجے میں جو بنیادی معاشرتی گراوٹ اور بنیادی معاشرتی اخلاقی رذائل کا پھیلاؤ ہے اس سے صرفِ نظر کرکے عوام کو اس سے مانوس کرکے ان کو اس بات کی طرف ترغیب دی جاتی ہے ان کو اس بات کی طرف دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ان سنگل اشوز کو حل کرنے کے لیے اپنی تمام تر روحانی اور جذباتی وابستگیاں اس عمل کے ساتھ لگائیں اور سمجھیں کہ سرمایہ دارانہ معاشرہ عدل قائم کرتا ہے انہی معنوں میں کہ وہ ان کو ان کے جو کچھ بھی جائز مسائل ہیں ان کے حل کے لیے منظم ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ اس طرح فرد کی توجہ اہم مسائل اور سوالات سے ہٹ کر صرف ایک چھوٹے سے مسئلے پر مرکوز ہو جاتی ہے اور یہی مسئلہ فرد کی اور کسی تحریک کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔

مغربی اور مذہبی معاشرت کا فرق:

سرمایہ دارانہ معاشرتی صف بندی کو چیلنج کرنے کی خاطر ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم سرمایہ دارانہ معاشرت کی روح کو اور سرمایہ دارانہ معاشرت کی کلیت کو متنازع فیہ بنائیں۔ سرمایہ دارانہ عقلیت کو

بحیثیت ایک عقلیت کے متنازع فیہ بتائیں اور ہماری تحریکات سنگلIssue موومنٹس نہ ہوں اور سنگل اشوموومنٹس کا جواز نہ پیش کریں۔ بلکہ سنگل اشو موومنٹس کو معاشرتی صف بندی کے عمل میں کلیدی کردار ادا کرنے سے روکیں اور ان کو یہ بات باور کرائیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کو بحیثیت ایک نظام کے رد کیے بغیر وہ ظلم اور وہ اخلاقی رذائل جو اس نظام کو قائم کرنے کے نتیجے میں معاشرے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہیں ان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا تحریکاتِ اسلامی اور غلبۂ دین کی تحریکیں معاشرتی صف بندی کی جو حکمتِ عملی اختیار کرتی ہیں اس حکمتِ عملی کی دو خصوصیات ہیں نمبر ایک یہ کہ وہ اس معاشرتی صف بندی کا احیاء کرنا چاہتی ہیں کہ جس کے نتیجے میں معاشرے میں ہر سطح پر محلے کی سطح پر، بازار کی سطح پر، شہر کی سطح پر، صوبے کی سطح پر، ملک کی سطح پر اور غرضیکہ ہر سطح پر قیادت کی ذمہ داری علماء کرام اور صوفیائے عظام سنبھالیں۔ یہ انہی کی ذمہ داری ہے قیادت کا منصب ان کا منصب ہے اور معاشرتی صف بندی کی تشکیل ان کی ذمہ داری ہے۔ نمبر دو ہماری تحریکات Single Issue Movements نہیں ہوتی۔ ہم سوشل ورک نہیں کرتے ہماری تحریکات بنیادی طور پر اس عقلیت کو اکھاڑ پھینکنے کی تحریکیں ہیں جو دنیوی زندگی میں لذت کے حصول کو زندگی کا مقصد قرار دیتی ہے اور جس کے نتیجے میں وہ اخلاقِ رذیلہ پھیلتے ہیں یورپ اور امریکہ میں جہاں بھی مغربی تہذیب نے غلبہ حاصل کیا وہی اخلاقِ رذیلہ پھیلے۔ انہی معنوں میں ہم اپنی معاشرت کو مغربی معاشرت کا ایک متبادل سمجھتے ہیں۔ مغربی معاشرت کے اندر ہماری معاشرت نہیں پنپ سکتی۔ مغربی معاشرت کے اندر اسلام کے لیے کوئی جگہ نہیں اور یہ بات عیسائیت کے حالیے سے ہم پہ واضح ہے۔ عیسائیت کے بارے میں عرض کروں گا بالخصوص علماء کی خدمت میں کہ اس وقت غیر اسلامی تحریکوں کے بارے میں علماء کی جو کچھ توجہ ہے وہ توجہ عیسائیت اور یہودیت پر مرکوز ہو کے رہ گئی ہے زیادہ تر علماء اور صوفیا جب غیر اسلامی تحریکات پر غور فرماتے ہیں تو ان کا مطمحِ نظر عیسائیت یا یہودیت ہوتا ہے۔

امت مسلمہ کا عیسائیت سے کوئی مقابلہ نہیں:

عیسائیت کے بارے میں یہ بات تقریباً مکمل یقین سے عرض کر سکتے ہیں کہ عیسائیت تو فنا ہو چکی ہے۔ عیسائیت سے ہمارا اس وقت کوئی مقابلہ نہیں، مقابلہ مغرب سے ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی فکر نے اور عیسائی روحانیت نے مغربی تہذیب کی نشو و نما میں ایک خاص کردار ادا کیا ہے لیکن اس وقت جو مد مقابل ہے وہ تہذیب مغرب ہے۔ تحریکِ تنویر (Enlighnment) اور تحریکِ رومانویت (Romanticism) سے ہمارا مقابلہ ہے۔ عیسائیت سے ہمارا مقابلہ نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے علماء اور اہلِ علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ عیسائیت کے مباحث سے صرفِ نظر فرمائیں اور بلاواسطہ تحریکِ تنویر اور تحریکِ رومانویت نے معاشرتی، علمی اور ریاستی سطح پر جو خطرات پیش کیے ہیں ان کا محاکمہ فرمائیں اور ان کے اسلامی رد کے لیے وہ علمیاتی حکمتِ عملی تیار کریں جس کے نتیجے میں مغربی فکر تہذیب اور فلسفے کا وقیع تنقیدی محاکمہ پیش کیا جا سکے۔

سرمایہ دارانہ ریاست:

سرمایہ دارانہ ریاست یا لبرل ریاست کے قیام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ ایک ایسی شخصیت پیدا کرے جو اپنے آپ کو آزادی کے سپرد کر دے۔سرمایہ دارانہ ریاست کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ ایک ایسی شخصیت کی تعمیر اور اسکی مستقل تخلیق کو ممکن بنائے جس کے اندر دو خصوصیات ہوں ایک تو یہ کہ وہ اپنی انفرادی زندگی میں بھی اس نظم وضبط کو قبول کرے جس کو قبول کیے بغیر آزادی، آزادی کے زیادہ سے زیادہ اضافہ کو، آزادی کو زیادہ سے زیادہ ممکن بنانے کا عمل ناممکن ہے۔یعنی ایک ایسی شخصیت کا وجود اور ایک ایسی شخصیت کی Reproduction،ایک ایسی شخصیت کی مستقل تخلیق جو اس بات کو قبول کرے کہ زندگی میں میرے وجود کی ضامن یہی بات ہے کہ میں کتنا زیادہ اس بات کے قائل ہو سکتا ہوں کہ میں جو چاہوں وہ کروں ۔اس قسم کی شخصیت خود بخود پیدا نہیں ہوتی جو اپنے اوپر آزادی کو خیر مطلق کے طور پر مسلط کرے ۔اس شخصیت کو قبول کرنے کے لیے ایک قانون کی ضرورت ہوتی ہے ایک جبر کی ضرورت ہوتی ہے وہ قانون اور وہ جبر جمہوری ریاست فراہم کرتی ہے۔

جبر کے بغیر انسان آزادی کا طلب گار نہیں ہوتا:

پہلی ضرورت جمہوری ریاست کے وجود کی یہ ہے کہ انسان جبر کے بغیر خود بخو د فطرتاً آزادی کی بڑھوتری کو مقصدِ زندگی کے طور پر قبول نہیں کرتا چنانچہ ہر دستور میں بالخصوص امریکی دستور میں جس چیز کو مقدس گائے کے طور پر رکھا گیا ہے اور جس کو جمہوری عمل سے ماوراء کی حیثیت دی گئی ہے وہ ہیں حقوق انسانی (Human Rights)۔حقوق انسانی کیا ہیں؟ حقوق انسانی دراصل وہ ذرائع ہیں جن کے بغیر سرمائے کی بڑھوتری کے فرض کو فرد ادا نہیں کرسکتا۔

حقوق انسانی کو جمہوری عمل کے اگر ماتحت کر دیں تو اس کا امکان بھی موجود ہے کہ حقوق انسانی کو رد کر دیا جائے ۔امریکی دستور جس وقت بننے لگا تو بالخصوص وہ مفکرین جنہوں نے فیڈرلسٹ پیپرز لکھے تھے، ھمیلٹن اور میڈیسن وغیرہ انہوں نے کہا کہ بنیادی مسئلہ یہی مسئلہ ہے کہ ایک اقلیت کے اوپر ایک اکثریت ایسے قانون مسلط نہ کر دے جو حقوق انسانی کے فروغ کو ملک میں ممکن نہ بنائیں ۔چنانچہ امریکی دستور کے اندر اور اس کے بعد جتنے دساتیر لکھے گئے ہیں سب کے اندر جو بنیادی اعتقاد ہے وہ بنیادی اعتقاد حقوق انسانی کا ہے۔گویا حقوق انسانی ایک ایسا عقیدہ ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہے اور اکثریت کو بھی اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ حقوق انسانی کو رد کرے۔ان حقوق کو ماننا، تسلیم کرنا اور اس کے لیے سہولتیں مہیا کرنا ہر ایک کا فرض ہے اور جو اس فرض کی راہ میں حائل ہو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

حقوق انسانی، پختہ مذہبی عقیدہ:

حقوق انسانی کے منشور کو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت پختہ مذہبی عقیدے کی حیثیت حاصل ہے

جس کا انکار ممکن نہیں ۔حقوقِ انسانی دستور کا دیباچہ ہیں جس کے نتیجے میں فرد کو اس بات کا مکلف بنایا جاتا ہے کہ وہ چند چیزوں کے معاملے میں خودمختار ہے مثلاً یہ کہ وہ اپنی زندگی کیسے گزارے گا کیا رائے رکھے گا؟ وہ رائے کا اظہار کس طریقے سے کرے گا اور سب سے اہم یہ کہ وہ سرمایہ دارانہ ملکیت کا تابع بنا دیا جاتا ہے ۔سرمایہ دارانہ ملکیت (Capitalist Property) اور اس کے جتنے بھی مضمرات ہیں حقوق انسانی کی تفصیل کے ضمن میں بیان کیے جاتے ہیں لہٰذا شخصیت کو اس طریقے سے تعمیر کرنا کہ وہ آزادی کو زندگی کا مقصد اولیٰ تصور کرے اور آزادی کو حاصل کرنے کے لیے اس جبر کو قبول کرے جو حقوق انسانی کو اداراتی شکل (Institutionalize) دینے کے لیے کسی معاشرے میں ضروری ہوتے ہیں یہ سرمایہ دارانہ جمہوری ریاست کا فرض اولین ہے اور اس فرض اولین کو ادا کرنے کے لیے فلسفہ حقوق انسانی کو سرمایہ دارانہ اور لبرل دستور کے دل کی حیثیت دے دی گئی ہے ۔چنانچہ ہر جمہوری نظام کے اندر ریاست کا اولین فریضہ یہ کہ وہ بنیادی حقوق کو دیگر تمام حقوق سے بالاتر تصور کرے ۔اس لیے آج آپ جانتے ہیں استعمار اس بات کا داعی ہے کہ ہر اس ملک میں جہاں اس کے مرتب کردہ بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے ہر اس ملک میں جہاں اس کے مروج کردہ بنیادی حقوق کی نفی ہو رہی ہے وہاں وہ عسکری مداخلت کرے اور اقوام متحدہ کی امن فورسز اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اب تقریباً اپنا یہ کردار امریکہ سے اور دیگر قوتوں سے منوا لیا ہے کہ فی الواقع بنیادی حقوق جو ہیں وہ عالمگیر قانون ہیں (Universal Law) اور بنیادی حقوق کیا ہیں؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ سرمایے کی بڑھوتری کی فرضیت کو ادا کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت انفرادی طور پر ہوتی ہے وہ بنیادی حقوق ہیں ان کو عالمی قانون کے طور پر نافذ کرنا اور عالمی قانون کی حیثیت سے تسلیم کرانا جمہوری ریاست کا اولین فرض ہے۔

حقوق انسانی سے بالاتر کوئی شے نہیں:

اگر جمہوری عمل کے نتیجے میں اس چیز کا خطرہ پیدا ہو کہ بنیادی حقوق سے بالاتر کسی قانون کو بحیثیت ایک نافذ قانون کے مان لیا جائے تو جمہوری عمل کو معطل کر دیا جاتا ہے ۔مثلاً ہمارے سامنے سب سے اہم مثال الجیریا کی ہے الجیریا میں فی الواقع ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں انتخابات کے ذریعے اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ایک ایسی حکومت قائم ہو گی جو شریعت کو بنیادی حقوق اور دیگر قوانین سے بالاتر حیثیت دے گی ۔لہٰذا فرانس اور امریکہ کی مدد سے ان انتخابات کو کالعدم قرار دے دیا گیا ۔تو یہ کوئی حادثاتی بات نہیں خود مغربی مفکرین کے ہاں بالخصوص اس وقت مغرب کا سب سے بڑا سیاسی مفکر جان رالس ہے اس کی کئی کتابیں ہیں اس کی مشہور کتاب ہے جو 1995ء میں چھپی جس کا نام ہے سیاسی لبرل ازم (Political Liberalism) ۔وہ اس کتاب میں کہتا ہے کہ اگر حقوق انسانی کو معطل کرنے کی تحریکیں اٹھیں تو آپ ان کو ایسے ہی تصور کریں جیسے وبا ہوتی ہے، طاعون یا جیسے کوئی اور وبا ہوتی ہے ۔ اسے ایک وبا کے طور پر تصور کریں اور بالکل جس طریقے سے وبا کو ختم کرنے کے لیے ہر عمل جائز ہے اسی طریقے سے ان تحریکوں کو بھی ختم کرنا جائز ہے ۔(دیکھیے پولیٹیکل لبرلزم ص ٦٤ ۔شائع کردہ

بلیک ول پبلشرز آکسفورڈ) تو الجیریا میں جو کچھ ہوا وہ کوئی حادثاتی نہیں تھا۔ سرمایہ دارانہ عقلیت اسی عمل کی متقاضی ہے۔ افغانستان کو بھی اسی لیے تباہ کیا گیا کہ اس نے دستوری اور جمہوری ریاست کا ڈھانچہ قبول نہیں کیا اور ایک متوازی ریاست بننے کی کوشش کی۔

جمہوریت آزادی کے حصول کا ذریعہ ہے:

اس لیے کہ جمہوریت یا انتخابات تو ایک ذریعہ ہیں آزادی کی بڑھوتری کے لیے، یہی تو انتخابات اور جمہوریت کا مقصد ہے اور اگر اس کے ذریعے وہ نتیجہ نہ نکلے تو ظاہر ہے کہ بنیادی حقوق کے نفاذ کا عمل معطل ہو جائے گا جو مقصود ہے جو مقدم ہے اور جو طریقہ ہے اس مقصود کو حاصل کرنے کا وہ حادثاتی ہے طریقہ دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی تو جیہہ متعدد حضرات نے امریکہ اور فرانس میں بیان کی کہ یہ کوئی حادثاتی بات نہیں، تو اگر انتخابی عمل کے ذریعہ کبھی یہ امکان پیدا ہوا کہ بنیادی حقوق کو منسوخ کیا جائے یا بنیادی حقوق کے اوپر اور بالاتر کوئی قانون نافذ ہونے کا احتمال ہوا تو ان انتخابات اور اس جمہوری عمل کو فی الفور کالعدم کر دیا جائے۔ یہ سرمایہ داری کے عالمی غلبے کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ انتخابات کے ذریعے بنیادی حقوق سے بالاتر کوئی دوسرا قانون نافذ کیا جائے اور استعمار اسے قبول کرے استعمار اس پہ مجبور ہے کہ اسے ختم کرے۔ استعمار منطقی طور پر اس پہ مجبور ہے کہ اسے ختم کرے اس کے سوا اس کے پاس کوئی دوسرا حل نہیں ہے۔ جو لوگ اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں یا تو وہ استعمار اور سرمایہ داری کی حقیقت سے واقف نہیں یا پھر فی الواقع مغربی تہذیب کے اندر اسلام کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے مسلم مفکرین کی یہ تمام تعبیرات کہ اسلام میں بھی انسانی حقوق کا تصور موجود ہے اور اسلام میں بھی سرمایہ داری کا ایک تصور موجود ہے۔ اسلامی معیشت یہی کہتی ہے وغیرہ یہ تمام تصورات یا تو کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہیں سرمایہ داری کی اصلیت کے بارے میں ناواقفیت کا ثمر۔ یا پھر فی الواقع اسلام کو مغربی تہذیب کا ایک حصہ تصور کرنے کا نتیجہ ہیں یہ وہی دلیل ہے جو ہمارے معذرت خواہ (Apologysts)۔ بیسویں صدی کے شروع میں اور انیسویں صدی کے آخر میں امیر علی، چراغ علی اور سر سید احمد خان دیا کرتے تھے کہ اصل میں تو مغربی تہذیب اسلام ہی سے نکلی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس بات کو اچھے طریقے سے سمجھ لینا چاہیے کہ سرمایہ دارانہ ریاست اور جمہوری ریاست ایک ہی چیز ہے دو چیزیں نہیں ہیں۔ جمہوری ریاست کا مقصد سرمائے کی بالادستی کو قائم کرنے کے سوا کچھ نہیں، باقی تو طریقہ کار ہے۔ انتخابات ایک طریقہ کار ہے جمہوریت یا جمہوری پارلیمنٹ عدلیہ اور انتظامیہ یہ طریقہ کار ہیں۔ مقصد صرف آزادی کی بڑھوتری ہے سرمائے کی بڑھوتری ہے۔ اور آزادی اور سرمائے کی بڑھوتری میں اگر جمہوری عمل، انتخابات کا عمل، پارلیمنٹ کا عمل عدلیہ کا عمل مانع ہو تو ظاہر ہے کہ وہ معطل کر دیا جائے گا۔ اور اصل مقصود یعنی سرمایہ داری بذریعہ بنیادی حقوق کے حصول کے لیے عالمی سرمائے کی بالادستی مسلط کر دی جائے گی تا کہ نظام کو بحیثیت نظام کے خطرہ نہ ہو۔

سرمایے کی عمومی حفاظت ریاست کے ذریعے:

ایک اور بات عرض کر دوں کہ ریاست کا ایک اور فریضہ جس پر زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں یہ ہے کہ وہ سرمائے کے عمومی مفاد کی محافظ ہے سرمائے کی بڑھوتری کے عمل میں ایک تضاد ہے ۔ وہ تضاد یہ ہے کہ سرمائے کی بڑھوتری کا عمل مسابقت سے ہوتا ہے ۔ فورڈز کمپنی، کرائسلر کمپنی کے خلاف جدوجہد کرتی ہے اور اگر فورڈز کمپنی کا منافع بڑھے تو کرائسلر کمپنی کا منافع کم ہوتا ہے سرمایہ مسابقت کے ذریعے بڑھتا ہے چاہے یہ مسابقت یعنی مارکیٹ میں ہو چاہے وہ پیداوار کی مارکیٹ ہو چاہے وہ فنانشل مارکیٹ ہو، مسابقت جو ہوتی ہے وہ متعین سرمایہ میں ہوتی ہے ۔ متعین سرمایہ کیا ہے؟ متعین سرمایہ کمپنیاں ہیں، کارپوریشنیں ہیں ۔ کارپوریشن چاہے فنانشل شکل میں ہو چاہے پیداواری (Manufacturing) شکل میں ہو چاہے خدمت (Service) کی شکل میں ہو ۔ متعین سرمایہ کی شکل کارپوریٹ شخصیت (Corporate Individuality) ہے ۔ مسابقت جو ہوتی ہے متعین سرمایہ کو بڑھانے کی مسابقت ہوتی ہے ۔ سرمایہ بحیثیت مجموعی کیسے فروغ پا سکتا ہے ۔ کسی کی براہ راست توجہ اس طرف نہیں ہوتی جو لوگ سرمائے کو عملاً بڑھا رہے ہیں، جو لوگ مارکیٹ میں موجود ہیں اور سرمایے کے فروغ کی کوشش کر رہے ہیں ،ان کی دلچسپی اپنے خاص سرمایے کی بڑھوتری سے ہوتی ہے ۔ عمومی سرمائے کی بڑھوتری سے ان کی دلچسپی نہیں ہوتی چنانچہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ان کی مسابقت کے نتیجے میں ان کا ذاتی سرمایہ تو بڑھے لیکن جو حکمت عملی وہ اپنا رہے ہیں اس کے نتیجے میں سرمایہ عمومی طور پر نہ بڑھے ۔ سرمایہ اس طرف چلا جائے جس طرف اس کے بڑھنے کے عمومی امکانات کم ہیں تو ریاست کا ایک بہت بڑا کام، سرمایہ دارانہ ریاست اور جمہوری ریاست کا ایک بہت بڑا وظیفہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی مجموعی حکمت عملی مرتب کرے جسے کہتے ہیں Macro Economic Policy اور اس کے تین شعبے ہیں تا کہ سرمایہ میں بحیثیت مجموعی اضافہ ہوتا رہے کسی خاص گروہ کے لیے سرمایہ مخصوص نہ ہو جائے ۔

۱ ۔ زری پالیسی (Monetry Policy) ۲ ۔ تجارتی پالیسی (Commerced Policy)
۳ ۔ مالیاتی پالیسی (Fiscal Policy)

ان تینوں پالیسیوں کے نفاذ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سرمایے کی بڑھوتری بحیثیت مجموعی مستحکم کی جائے اور متعین سرمایہ کے درمیان مسابقت کو اس طریقے سے مرتب کیا جائے کہ اس کے نتیجے میں سرمایہ بحیثیت مجموعی بڑھتا رہے ۔ زری پالیسی، مالیاتی پالیسی اور تجارتی پالیسی، یہ تینوں چیزیں ہر سرمایہ دارانہ ریاست کے وظائف میں شامل ہیں ۔ اور ان تینوں پالیسیوں کو اختیار کر کے سرمایہ دارانہ ریاست یا جمہوری ریاست اپنا یہ فرض ادا کرتی ہے کہ معین کارپوریشنوں (Specific Corporations) کے درمیان جو مسابقت ہے اس کو اس طریقے سے مرتب کرے کہ مجموعی سرمایے کے اضافے اور بڑھوتری کی رفتار میں کمی نہ آئے ۔ مجموعی بڑھوتری کے امکانات روشن رہیں ۔

قومی سرمایہ اور عالمی سرمایہ:

اب یہاں سے ہمیں قومی سرمایے اور عالمی (Global) سرمایے کے درمیان جو فرق ہے وہ واضح ہونے کا امکان نظر آتا ہے۔ عموماً سرمایہ دارانہ ریاستی صف بندی یا سرمایہ دارانہ سیاسی صف بندی قومی ریاست کی سطح پر ہوتی ہے کس ریاست کی میکرو اکنامک پالیسی ہوتی ہے، ہر قومی ریاست کی مالیاتی پالیسی ہوتی ہے، زری پالیسی ہوتی ہے، تجارتی پالیسی ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں سرمائے کی عمومی بڑھوتری کا تحفظ کیا جاسکتا ہے اور اس طرح عمومی سرمائے کی بڑھوتری کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ یہ کام قومی ریاستوں کا ہے۔ مثلاً پاکستانی ریاست کی ایک مالی پالیسی ہے۔ پاکستانی ریاست کی ایک زری پالیسی ہے۔ سٹیٹ بنک زری پالیسی بناتا ہے پاکستانی ریاست کی تجارتی پالیسی ہے وغیرہ۔ لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ سرمایہ تو اب قومی رہا نہیں۔ سرمائے کی بڑھوتری جس سطح پہ ہوتی ہے وہ قومی سطح نہیں وہ تو بریٹن وڈ (Bretinwood) کا نظام تھا جس کا میں نے پہلے تذکرہ کیا تھا۔ 1933ء سے 1980ء تک یہ صف بندی قائم رہی۔ فورڈازم سرمایے کی عمومیت سے مراد قومی سرمایہ ہوتا ہے۔ مثلاً انگریز کا سرمایہ، امریکی کا سرمایہ، جاپان کا سرمایہ، جرمن کا سرمایہ وغیرہ۔ بریٹن وڈ نظام میں جب ہم سرمایہ کی عمومی سطح پر گفتگو کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد قومی سطح ہوتی ہے۔ عمومی سرمایہ سے مراد تھی قومی سرمایہ یعنی ریاست کا مقصد قومی سرمایہ کا تحفظ تھا۔ مالیاتی پالیسی کا احاطہ فورڈازم میں قومی سطح پر ہوتا تھا۔ اب کیا ہوا ہے؟ اب یہ ہوا کہ سرمایہ تو ہوگیا بین الاقوامی، سرمایہ تو ہوگیا عالمی۔ اصل میں بین الاقوامی لفظ غلط ہے۔ بین الاقوامی نہیں گلوبل (عالمی)۔ گلوبل یونیورسل یعنی عالمگیری نہیں ہے۔ سو اب سرمایہ تو عالمی یعنی گلوبل ہوگیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر سرمایے کی عمومی بڑھوتری کے تحفظ کا انتظام کیا جائے تو اس کو بھی عالمی سطح پر ہونا چاہیے کیوں؟ اس لیے کہ اب سرمایہ کا مجموعی مفاد اس میں ہے کہ منافع عالمی سطح پر ممکن ہوسکے۔ سرمائے کی ترسیل پہ تمام حد بندیاں ہٹ گئی ہیں اور ختم ہوگئیں ہیں اور جب سرمایہ دار یہ کہتا ہے کہ مجھے منافع کو بڑھانا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے منافع کو اس چیز سے ماوراء ہو کر بڑھانا ہے کہ یہ منافع پاکستان میں بڑھے گا یا انگلستان میں، فن لینڈ میں، روس میں تو بحیثیت مجموعی اپنے سرمائے سے زیادہ سے زیادہ منافع کمانا چاہتا ہوں میں تو وہاں پیسہ لگاؤں گا جہاں سے زیادہ سے زیادہ منافع ہو۔ چنانچہ قومی سطح سے اوپر اٹھ کر وہ عالمی سطح پہ پہنچ گیا ہے۔ اب جمہوری ریاست کا جو فریضہ ہے وہ یہ ہے کہ اس گلوبل سطح پر عمومی سرمائے کی بڑھوتری کا تحفظ کرے اور اس کو ممکن بنائے۔ قومی سطح پر یہ کام کرنا اب ممکن نہیں رہا اس لیے کہ سرمایہ اب عالمی ہوگیا ہے قومی نہیں رہا۔ اب جمہوریت کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ گلوبل سطح پر یہ ریاست قائم نہیں کی جاسکتی گلوبل سطح پر جمہوری ریاست قائم نہیں ہوسکتی وہ کیوں نہیں قائم کی جاسکتی اور امریکہ اس موجودہ نظام میں ایک خاص کردار کیسے ادا کر رہا ہے اس پر میں اگلے باب میں تفصیل سے عرض کروں گا۔

عالمی مالیاتی نظام سرمایہ کا عالمی غلبہ:

یہاں صرف اتنی بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آج بین الاقوامی مالیاتی نظام کا حصہ بننا عالمی سطح پر سرمایے کی بڑھوتری کے تقاضوں کو پورا کرنے کا دوسرا نام ہے۔ جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ بین الاقوامی

سطح پر جو بھی مالیاتی نظام ہے اس کا ایک حصہ بننا چاہتے ہیں ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس پر تیار ہیں کہ ہم بنیادی طور پر وہ نظم و ضبط قبول کریں گے جس نظم کو قبول کرنے کے نتیجے میں سرمایے کو عالمی سطح پر بڑھوتری کے عمل میں مدد دی جاسکے ۔لہٰذا قومی ریاستیں باستثنائے امریکہ...... [امریکہ ایک استثناء ہے اس کے بارے میں میں پھر عرض کروں گا]...... سرمائے کی بین الاقوامی تنظیم کے ماتحت ہو گئی ہیں یہ جو تنظیم ہے یہ گلوبل نہیں ہے یہ بین الاقوامی ہی ہے یہ جو سرمائے کی پبلک سیکٹر کی تنظیم ہے یہ جو سرمائے کی ریاستی تنظیم ہے یہ مکمل تنظیم ہے یہ بین الاقوامی ہی ہے ۔گلوبل نہیں ہے سرمایہ خود گلوبل ہے لیکن اس کی ریاستی تنظیم بین الاقوامی ہے ۔قومی ریاستیں اس بین الاقوامی تنظیم کے ماتحت کی جا رہی ہے ۔اور جمہوری عمل کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے قومی ریاستوں کا بین الاقوامی ہیئتوں (Structures) کے ماتحت ہو جانا اور اس کی بالادستی کو قبول کرنا ضروری ہے ۔اگر بین الاقوامی ریاستی ڈھانچے سے قومی ریاستیں لا تعلقی کا اظہار کر دیں تو وہ جمہوری ریاستیں نہیں رہ سکتیں ۔کن معنوں میں؟ ان معنوں میں کہ سرمائے کی عالمی بڑھوتری کو ممکن بنانے میں ان کا حصہ نہیں ہو سکتا اور اگر بین الاقوامی سطح پر نہیں ہو سکتا تو سرمایہ دارانہ نظام سے وہ کٹ گئیں جمہوری نظام سے وہ کٹ گئیں لہٰذا آج قومی سرمایہ کوئی چیز نہیں ۔قومی سرمایہ سرے سے کوئی چیز نہیں ۔قومی حکومتیں یقیناً ہیں قومی ریاست یقیناً موجود ہے قومی سرمایہ کوئی چیز نہیں ہے اور قومی سرمایہ گلوبل سرمائے میں ضم ہو گیا ہے ۔قومی ریاست بین الاقوامی ریاست کے نظام کی ماتحت ہو گئی ہے ۔ اسی چیز کو ہم سرمایہ کا عالمی غلبہ اور تسلط کہتے ہیں ۔سرمایہ کے عالمی غلبہ اور تسلط سے مراد یہی ہے کہ قومی ریاست گلوبل سطح پر سرمائے کی بڑھوتری کے عمل کو اپنے اوپر حاکم تسلیم کر لے ۔

پاکستان کی دو بڑی جمہوری جماعتیں ہیں ان کا تذکرہ کرنا ضروری نہیں لیکن ان کے پروگرام کا اگر آپ جائزہ لیں تو دو چیزوں کی مماثلت پائیں گے اسی وجہ سے وہ دونوں اپنا وجود برقرار رکھ پاتی ہیں اور حکومت بھی کر سکتی ہیں وہ دو چیزیں کیا ہیں اول یہ کہ وہ دونوں اس چیز کی متقاضی ہیں کہ استعمار ان کی پشت پناہی کرے ۔استعمار سے وہ امداد کی طالب ہیں اور کن بنیادوں پر؟ انہیں بنیادوں پر کہ وہ اس پروگرام کو جو استعمار کی بین الاقوامی تنظیمیں پاکستان پر مسلط کرنا چاہتی ہیں اس پروگرام کو وہ قبول کرتی ہیں وہ دونوں جماعتیں IMF کے جو سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام (Structural Adjustment) یا ورلڈ بینک کے جو معاہدے ہیں یا ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے تحت پاکستان کی جو یقین دہانیاں (Commitment) ہیں ان کو پورے کے پورے طور پر قبول کرتی ہیں اور معاشی حکمتِ عملی میں دونوں جماعتوں نے انٹرنیشنل آرگنائزیشنز کے ۔ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور IMF اور ورلڈ بینک وغیرہ کے پروگرام کو پورے کے پورے طور پر قبول کر لیا ۔استعماری معاشی پروگراموں کی قبولیت کے بارے میں ان میں کوئی اختلاف موجود نہیں ۔ دوسری بات جو ان دونوں جماعتوں میں مشترک ہے اور اس میں کوئی متنازعہ فیہ بات نہیں ہے وہ یہ ہے کہ یہ دونوں جمہوری جماعتیں ہیں ان معنوں میں کہ وہ دونوں آزادی اور سرمایہ کی بڑھوتری چاہتی ہیں ۔دونوں کی تاریخ جمہوریت سے رقم ہے اور یہ دونوں جمہوری

جماعتیں استعمار کی حلیف ہیں اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ظاہر ہے جمہوریت کا مقصد ہی سرمائے کی بڑھوتری بحثیت مجموعی ہے جمہوری جماعتیں آزادی کی خواہش مند ہیں وہ یہ نہیں کریں گی تو اور کیا کریں گی؟اس لیے اس میں تعجب واستعجاب کی کوئی گنجائش نہیں کہ جمہوری جماعتیں استعمار کی حلیف ہیں۔ ظاہر ہے استعمار کیا چاہتا ہے۔آزادی کی بڑھوتری، یہی تو وہ چاہتا ہے، یہی اس کا مقصد ہے اور یہی جمہوریت کا دوسرا نام ہے۔تو اگر جمہوری جماعتیں IMF اور ورلڈ بینک کے پروگراموں کو قبول کریں تو یہ کوئی اکراہ کی بات نہیں ہے۔کوئی اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس پر مجبور ہیں۔میں آپ سے عرض کروں پاکستان استعماری معاشی پروگرام کو قبول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بالکل قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔کیونکہ پاکستان کی معیشت ایک مضبوط معیشت ہے۔

پاکستانی معیشت مستحکم معیشت ہے:

پاکستانی معیشت ایک نہایت طاقتور اور مستحکم معیشت ہے۔پاکستانی معیشت کو کسی بحران کا سامنا نہیں ہے دیکھیں یہ بات محض کہنے کی بات نہیں 2000-1999 کے اعداد وشمار اگر آپ دیکھیں تو اس میں یہ بات بالکل ثابت ہوجاتی ہے۔2000-1999 کی کیا خصوصیت ہے اس سال کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سال ہمیں بین الاقوامی سطح سے تقریباً کوئی امداد نہیں ملی ایک بلین کے کچھ قرضے بالکل معمولی (Trivial) تھے تقریباً کوئی امداد نہیں ملی۔جب ہم نے جوہری دھماکہ کیا تو 1998ء کے بعد سے ہماری بین الاقوامی امداد بند ہوگئی۔لیکن یہ کہ پائپ لائن میں کچھ پیسے موجود تھے۔ایسے پیسے جو پہلے سے منظور (Sanction) ہوگئے تھے لیکن اس کی تقسیم نہیں ہوئی تھی وہ ملتے رہے 1999-1998ء میں ہمیں امداد ملتی رہی۔2000-1999ء میں فی الواقع پورے طور پر وہ تحدیدات جو جوہری دھماکے کے نتیجے میں ہمارے اوپر لگائی گئی تھیں نافذ ہوگئیں اور بالخصوص IMF، ورلڈ بینک اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک اور اسلامک بینک سے تو ہمیں ایک دھیلا بھی نہیں ملا۔یہ بات بھی اچھے طریقے سے سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامک ڈویلپمنٹ بینک بھی ورلڈ بینک اور IMF کا ویسا ہی حلیف ہے جیسے ایشین ڈیولپمنٹ یا افریقین ڈویلپمنٹ بینک ہیں وغیرہ۔اسلامک ڈویلپمنٹ بینک کی حیثیت میں اور بین الاقوامی نظام میں کوئی فرق نہیں ہے۔2000-1999 میں ہمیں IMF، ورلڈ بینک، ADB اور اسلامک ڈویلپمنٹ بینک کہیں سے کچھ نہیں ملا نہ صرف یہ کہ کہیں سے کچھ نہیں ملا بلکہ ہم نے تقریباً 6 بلین ڈالر اپنے وسائل سے پرانے سود اور واجبات کے طور پر ان کو ادا کیے۔فی الواقع 2000-1999 میں ہم نے IMF اور ورلڈ بینک کو امداد دی ہے۔انہوں نے ہمیں 2000-1999 میں کوئی امداد نہیں دی۔اس سال ہمارے ہاں IMF کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔کوئی ہمارے اوپر IMF کی نگرانی (Supervision) نہیں تھی۔اس سال ہماری شرح نمو۔جسے ہم اپنی مجموعی پیداوار کہتے ہیں۔(Growth Demestic Product) ہماری شرح نمو 4.9% تھی، ہماری شرح Inflation صرف 3.6% تھی۔یہ اعداد وشمار یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ پاکستان عالمی بینک آئی ایم الیف کی امداد کے بغیر بھی اپنی معیشت کے استحکام کو برقرار رکھ سکتا

ہے۔

پاکستان کے قدرتی وسائل روس سے زیادہ ہیں:

پاکستانی معیشت فی الواقع ایک خودکفیل معیشت ہے 2000-1999 میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ فی الواقع اگر ہم بین الاقوامی نظام سے اپنا ناتو ڑنا چاہیں تو بالکل ہم ایسا کر سکتے ہیں ۔اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے ،کوئی ٹیکنالوجیکل ،کوئی فنانشل تحدید (Constrant) نہیں ہے۔آپ جانتے ہیں ایک تنظیم ہے جسے کہتے ہیں یونیسکو United Nations Educational Scientific and Cultural Organization۔1999ء میں اس نے قدرتی وسائل (Natural Resourses) کا ایک سروے کیا اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ قدرتی وسائل کے لحاظ سے ممالک کی کیا حیثیت ہے؟ تو اس مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ پاکستان کے قدرتی وسائل کی استطاعت (Capacity) روس سے زیادہ ہے۔نہایت طاقتور اور مستحکم معیشت ہے اور امداد و قرضوں کی صورت سال میں جو پیسہ بھی ملک میں آتا ہے وہ ہماری مجموعی سرمایہ کاری کا 10% بھی نہیں ہوتا ۔90 سے 92 فی صد ہر سال سرمایہ کاری ہم اپنے پیسے سے کرتے ہیں ۔ ہماری جو مجموعی برآمدات و درآمدات ہیں ہماری مجموعی قومی پیداوار کا 20 سے 25 فی صد حصہ ہیں کسی معنی میں بھی یہ بات نہیں کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان مجبور ہے اس بات پر کہ وہ بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بنا رہے کوئی مجبوری نہیں ہاں یہ راہ ہم نے منتخب کی ہے۔

جمہوری حکومت کا مطلب کیا ہے؟

ہم جمہوری لوگ ہیں ہماری فوجی حکومتیں بھی جمہوری حکومتیں ہوتی ہیں ۔ ان معنوں میں جمہوری حکومتیں ہوتی ہیں کہ سرمائے کی بڑھوتری یا ترقی اور فلاح کے سوا ان کے سامنے کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا ہے ۔ہم بالکل خالص جمہوریت پر ایمان لا چکے ہیں چاہے وہ سول حکومت ہو چاہے وہ فوجی حکومت ہو، ہوتی جمہوری حکومت ہی ہے ۔کیوں کہ جمہوری حکومت کا اصل مطلب جمہوری حکمرانی نہیں بلکہ سرمایہ داری کی حکمرانی ہے اور اس کا اصل آلہ کار بنیادی حقوق ہیں لہٰذا وہ حکومتیں جو سرمایہ دارانہ نظام کی راہ میں رکاوٹ کا باعث نہیں تھی امریکا کے لیے قابل قبول ہیں ۔خواہ وہ غیر جمہوری حکومتیں ہوں لیکن جمہوری حکومت بھی اگر سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے عقائد و فلسفہ کی راہ میں رکاوٹ ہے تو اس کو تہس نہس کر دیا جاتا ہے۔2000-1999ء میں ہم نے اہم کامیابی یہ حاصل کی کہ اس سال ہمارا روپیہ بین الاقوامی بازاروں میں بالکل مستحکم رہا ہر سال جب بھی ہم IMF کے ماتحت رہتے ہیں ہمارا روپیہ 10% کے حساب سے اپنی قدر کھو دیتا (De Value) ہے سن دو ہزار میں یہی ہوا ہے چنانچہ نومبر میں جب ہم نے آئی ایم ایف کے ساتھ نیا معاہدہ (Agreement) کیا ہے Stand by کے ساتھ روپیہ De Value ہونا شروع ہو گیا ہے ۔لیکن 2000-1999ء میں روپیہ De Value نہیں ہوا ۔ایک فیصد بھی De Value نہیں ہوا ۔تو فی الواقع اگر ہم خود کفالت کی حکمت عملی اختیار کرتے ہیں

تو بین الاقوامی بازار میں مستحکم ہوتے ہیں، طاقتور رہتے ہیں ۔کمزور نہیں ہوتے ہیں لیکن جمہوری نہیں رہتے یہ صحیح بات ہے ۔سرمائے کی عالمی بڑھوتری کی جو خدمت آپ نے اپنی ریاست کے لیے منتخب فرمائی ہے وہ آپ ادا نہیں کر سکتے لہٰذا جمہوریت ہمارے لیے کوئی لازمہ نہیں ہے ۔جمہوریت ہمارے لیے کوئی مجبوری (Pre-Determined Choice) نہیں، کوئی ہمارے اوپر مسلط نہیں کر سکتا اور ہمارے پاس بالکل اختیار موجود ہے کہ ہم کوئی ایسا سیاسی اور معاشرتی نظام اختیار کریں جو خالصتاً اسلامی نظام ہو اور جو بین الاقوامی سرمایہ دارانہ اداروں کی بالادستی کو بھی رد کرے اور عالمی سرمایہ کی ماتحتی کو بھی رد کرے یہ بالکل ممکن ہے ۔لیکن چونکہ سیاسی وجوہ کی بنا پر ہم نے اپنے لیے جو راہ مقرر کی ہے وہ راہ ہے جمہوریت کی بالادستی کی راہ، وہ راہ سرمائے کے عالمی بالادستی کو قبول کرنے کی راہ، اور اس راہ کو قبول کرنے کے لیے اور اس کو ممکن بنانے کے لیے جو حکمت عملی ہم نے اس وقت اپنائی ہے وہ مقامیت (Localization) ہے۔

ہم پوسٹ ڈیموکریٹک دور میں زندہ ہیں:

مقامیت (Localization) کے عمل کو اچھے طریقے سے سمجھنا اور اسے بالکلیہ رد کرنا ہماری ضرورت ہے ۔مقامی انتخابات میں حصہ لینا اور مقامی اداروں کا حصہ بننا استعمار کی اسی حکمت عملی کو ممکن بنانا ہے جس حکمت عملی کے تحت وہ پاکستان کو بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام کا ایک حصہ بنانا چاہتا ہے اور جس کے نتیجے میں سرمائے کے عالمی غلبہ (Hegemony) کو وہ پاکستان کے لیے قابل قبول بنانا چاہتا ہے ۔سرمایہ دارانہ نظام کی ایک کمزوری اس وقت یہ ہے کہ وہ جمہوری عمل کو قومی ریاست سے اوپر نہیں اٹھا سکتا ۔لیکن ایک بہت بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت ہم جس دور میں ہیں وہ امریکی مفکرین کے مطابق پس جمہوری دور (Post Democratic) ہے ۔ہم سرمایہ داری کے پس جمہوری دور (Post Democratic) میں زندہ ہیں ۔پس جمہوری دور سے کیا مراد ہے؟ یہ مراد کہ عوام کی اکثریت جمہوریت سے مایوس ہو گئی ہے ۔جمہوری عمل میں شرکت سے مایوس ہو گئی ہے اور جمہوری عمل میں شرکت سے لاتعلق ہو گئی ہے ۔امریکہ میں تو بغیر شک کے اکثریت کا جمہوریت سے ایمان اٹھ چکا ہے اور امریکی نوجوان تو بالکل ہی جمہوری عمل سے تعلق نہیں رکھتے ۔کتنا بھی وہ عمر کو کم کر دیں ۔مغرب میں تو آزادی کی اصلیت واضح ہو گئی ہے کہ آزادی دراصل کیا ہے آزادی جو ہے اس سے زیادہ بڑا جبر تو کوئی ہے ہی نہیں ۔اصلی جبر اگر کوئی ہے تو وہ آزادی ہے یہ بات تو مغرب میں واضح ہو گئی ہے اس وجہ سے ہم پس جمہوری دور (Post Democratic) میں رہ رہے ہیں ۔چنانچہ کوئی ایسی بڑی اجتماعیت بنانا جمہوریت کی بنیاد پر ممکن نہیں رہا۔ جس قسم کی 1933ء سے لے کر 1980ء کے دوران اجتماعیتیں بنی تھیں جہاں جمہوری عمل کی تصدیق کے لیے ایک نئی شناخت دی گئی تھی کہ تم مزدور ہو وغیرہ وغیرہ وہ تو سب ناکام ہو چکیں لوگ تو تنہا ہو گئے ہیں ۔چنانچہ یہ کہنا کہ ایک بین الاقوامی ریاست قائم کی جائے گی وہ تو ایک ناکام تجربہ ہے جیسا کہ یورپ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان تمام ممالک کو ملا کے نئی فیڈریشن بنانے کا منصوبہ بالکل ناکام ہو

گیا ہے ان معنوں میں ناکام ہے کہ یورپی انتخابات میں دس فیصد ووٹ بھی نہیں پڑے۔قومی انتخابات میں تو ان کے ہاں 60سے 70فی صد کے درمیان ووٹ پڑ جاتے ہیں لیکن یورپین انتخابات میں سرے سے ووٹ ہی نہیں ڈالے جاتے اور یورپین پارلیمنٹ کے کہنے کے باوجود کوئی اثر نہیں۔یورپین سینٹرل بینک کا حال نہایت زبوں ہے اس کے ہر عمل کی قومی بینک مخالفت کرتے ہیں اس کی کوئی عوامی حمایت موجود نہیں۔چنانچہ قومی سطح سے اوپر اٹھ کر کسی بھی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام سیاسی تنظیم قائم کرے کا اس وقت اہل نہیں ہے یہ اس کی بنیادی کمزوری ہے۔

جمہوری عمل کو جاری رکھنا ایک مسئلہ بن گیا ہے:

قومی سطح پر جمہوری عمل کو جاری رکھنا سرمایہ دارانہ ریاستوں کے لیے بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔لوگوں کی کوئی دلچسپی نہیں اس سے اوپر اٹھنے کا کیا سوال؟ لہٰذا کس طریقے سے سرمایہ دارانہ عمل کی قبولیت کو قائم رکھا جائے؟ یہ اس وقت سرمایہ دارانہ سیاسی مفکرین کے لیے نہایت اہم سوال ہے۔غریب ممالک کے لیے انہوں نے جو اس کا حل تلاش کیا ہے وہ ہے مقامیت۔مقامیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ بڑے ممالک کو توڑ کر چھوٹے ممالک بنائے جائیں مقامیت کا مطلب یہ ہے کہ قومی ریاست اور قومی ریاست کے عمل سے عام آدمی کی دلچسپی ختم کر دی جائے اور مقامی سطح پر عام آدمی کو اپنی اغراض کا بندھنا دیا جائے۔مقامی حکومتیں (Local Governments) بین الاقوامی سرمائے کی ایجنٹ حکومتیں ہوں گی۔وہ کوئی ان معنوں میں حکومتیں نہیں ہوں گی جیسا کہ صاحب اقتدار حکومتیں ہوتی ہیں یا جن معنوں میں اسلام آباد میں ہماری وفاقی (Federal) حکومت صاحب اقتدار حکومت ہے مقامی حکومتوں کا بنیادی وظیفہ اپنے علاقے میں سرمائے کی بڑھوتری کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور جہاں یہ تجربے کیے گئے ہیں مثلاً انڈونیشیا، جکارتہ میں اور جنوبی ہندوستان میں وہاں جو عملی شکل سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ مقامی حکومتوں نے ایک دوسرے سے اس چیز کے لیے مقابلہ اور مسابقت کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ سرمائے کو اپنے ملک میں کیسے راغب (attract) کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے پوری توجہ اس چیز پر دی ہے کہ اپنے علاقے کو بین الاقوامی یا عالمی سرمائے کے لیے زیادہ سے زیادہ پرکشش بنائیں اس کے لیے انہوں نے جو دو طریقے اختیار کیے ہیں ان میں ایک ہے بین الاقوامی بانڈ جاری کرنا (Floatation of International Bonds)انہوں نے قومی اور بین الاقوامی بازاروں میں اپنے بانڈ جاری کیے ہیں بانڈ بیچے ہیں اب ظاہر ہے کہ جو بانڈ خریدے گا تو اس لیے خریدے گا کہ اس سے ڈیویڈینڈ Dividend ملے سود ملے۔اس کو مستقل آمدنی ہو چنانچہ ان حکومتوں نے اگر وہ پالیسیاں نہیں اختیار کیں کہ جس کے نتیجے میں منافع میں اضافہ ہو رہا ہو۔اس طریقے سے کہ وہ منافع بانڈ خریدنے والے کو بھی مل رہا ہے تو وہ بانڈ بیچ دے گا ان بانڈز کی کوئی قیمت نہیں ہوگی لہٰذا جس وقت مقامی حکومت کی حکمت عملی اس بات پر منحصر ہو جائے کہ اس کے میزانیہ (بجٹ) کا ایک بڑا ذریعہ بانڈز بن جائیں تو وہ مجبور ہے کہ اس نوعیت کی پالیسی اختیار کرے کہ جس کے نتیجے میں عالمی سرمایہ کی مقدار میں زیادہ سے زیادہ

اضافہ ہو سکے۔ منافع کی شرح میں اضافہ ممکن ہو سکے۔

دوسرا طریقہ نج کاری یا پرائیویٹائزیشن ہے۔ نج کاری سے مراد یہ کہ اپنے وسائل کو بین الاقوامی کمپنیوں کو عالمی سرمائے (Global Capital) کے سپرد کر دو۔ مثلاً جکارتہ میں پورا پانی کا نظام ایک امریکی یہودی کمپنی کے سپرد کر دیا گیا۔ یا یہ کہ بنگلور اور مدراس میں ایسی مستقل مثالیں دی جا سکتی ہیں، مقامی حکومت قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عوام کو صرف اور صرف اغراض کے گرد، مسائل کی سیاست کے گرد، ایشوز کے گرد مرتکز کیا جائے اور اغراض کے حصول کے ارد گرد عوام کو متحد کیا جائے۔ کہا جائے کہ لوکل گورنمنٹ Agencies ہیں یہ ایک اچھی حکمرانی (Good Governance) کا ذریعہ ہیں۔ اچھی حکمرانی سے کیا مراد ہے؟ یہ کہ اس نوعیت کی حکومت قائم کرنا کہ جس کے نتیجے میں سرمائے کے اضافے اور سرمائے کی ترسیل میں اس علاقے کا حصہ زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ جو مقامی حکومت ہوتی ہے وہ خودمختار ہوتی ہے ہاں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومی حکومت کمزور ہو جاتی ہے۔ قومی حکومت کمزور کیوں ہو جاتی ہے؟ قومی حکومت اس لیے کمزور ہو جاتی ہے کہ مقامی حکومتوں کے قیام میں سیاست علیا (Hight Politics) t جائز ہو جاتی ہے۔ سیاست علیا کیا ہے؟ ہائی پالیٹکس وہ پالیٹکس ہے جو ایک ریاست کی شناخت متعین کرتی ہے اب موجودہ دور میں ایک ریاست کی شناخت متعین کرنے کے لیے دو حکمت عملیاں، دو پالیسیاں نہایت اہم ہیں۔ ایک خارجہ پالیسی (Foreign Policy) اور دوسری معاشی پالیسی (Economical Policy)۔ اگر آپ اسے ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو اسلامی ریاست بنانے کے لیے آپ کو ایک خاص نوعیت کی معاشی پالیسی اختیار کرنا پڑے گی اور ایک خاص نوعیت کی خارجہ پالیسی اختیار کرنا پڑے گی۔ جہاں بھی اور جب بھی بیسویں صدی میں اسلامی ریاست قائم ہوئی چاہے وہ سوڈان ہو چاہے وہ ایران ہو چاہے افغانستان ہو عوام کی قربانی دینے کی صلاحیت ہی کا امتحان لیا گیا۔ اسلامی ریاست کے قیام کے نتیجے میں لوگوں کا معیار زندگی بلند نہیں ہوا لوگوں کو فاقے کا مقابلہ کرنا پڑا لوگوں کو جانوں کے نذرانے دینا پڑے۔ لوگوں کو اپنے معاشروں کو اتھل پتھل ہوتا ہوا دیکھنا پڑا لوگوں کو استعمار کا ظلم اور جبر برداشت کرنا پڑا۔ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے لازم ہے کہ لوگ اپنی اغراض کو پس پشت ڈال دیں ضرورت ہے کہ لوگ قربانی اور ایثار کے لیے تیار ہوں اور وہ غلبہء دین کی جدوجہد معیار زندگی بلند کرنے کے لیے نہ کریں بلکہ جدوجہد غلبہء اسلامی حصول رضائے الٰہی اور شہادت کے شوق کے لیے کریں۔ مقامیت یعنی لوکلائزیشن تو انسان کو غرض کا بندہ ہی بناتی ہے اور وہ شخص جو کراچی میں بین الاقوامی سرمائے کی بڑھوتری کو ممکن بنانے کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیتا ہے غلبہء دین کے لیے کیا کام کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے کیا قربانی دے گا؟ وہ تو پانی کے اور گٹروں کے انتظام اور بسوں کی آمدورفت کو زندگی کا مقصد رکھے گا۔ اچھی حکومت (Good Governance) کو زندگی کا حاصل سمجھے گا۔

چنانچہ مقامیت (لوکلائزیشن) کے عمل کے تحت۔ یہ اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ اقتدار نیچے

منتقل نہیں ہوتا اقتدار اوپر جاتا ہے اگر ہم وہ حکمت عملی اپنائیں وہ خارجہ پالیسی اپنائیں جو غرب کو پسند ہو یا Macro اکنا مک پالیسی وہ اختیار کریں جس پہ IMF اور ورلڈ بینک تصدیق کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں فی الواقع ہم عالمی سرمایہ دارانہ ریاست کے باج گزار کی حیثیت اختیار کر لیں گے یہ پاکستان کو کمزور کرنے کی حکمتِ عملی ہے توڑنے کی حکمتِ عملی نہیں ہے۔ اقتدار اعلیٰ کو اوپر کی طرف منتقل کرنے کی حکمت عملی ہے اور عوام کو ہائی پالیٹکس سے جس کے نتیجے میں پاکستانی ریاست کا تشخص متعین ہوتا ہے اس سیاست سے ہاتھ کھینچ لینے کی طرف تیار کرنے کی حکمت عملی ہے۔ پاکستان کے عوام اس چیز کی طرف توجہ دیں کہ ان کو حقوق کتنے مل رہے ہیں وہ اپنے اوپر ظلم ختم کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔ اس طرف متوجہ نہ ہوں کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کائنات کی اور آخرت کی حقیقت کیا ہے امت مسلمہ کا مقصد وجود کیا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر استعمار کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں کس نوعیت کی معاشی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ یہ تمام باتیں کہنے سننے کی باتیں ہیں ہمیں ان کو بھول جانا چاہیے اور ہماری ریاست اس قابل ہی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اس نوعیت کے معاملات پر کوئی بھی مؤثر قدم اٹھا سکے۔ بلکہ ہماری ریاست کو استعمار کی ایک باج گزار ریاست ہونا چاہیے ایک ایسی ریاست ہونا چاہیے جس کا مقصد وجود یہ ہو کہ مقامی حکومتوں کو اس بات کے لیے تیار کیا جائے کہ وہ عالمی سرمائے کو اپنے دائرۂ کار میں کھینچ (Attract) سکیں اور اس کے ساتھ ایسا معاملہ کر سکیں کہ لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو اور ہم ایک فلاحی ریاست قائم کر لیں۔ یورپ میں ویلفیئر سٹیٹس مفادات، ذاتی اغراض کی بنیاد پر قائم ہوئیں، اجتماعیت کو برقرار رکھنے کے لیے سول سوسائٹی کا تجربہ کیا گیا لیکن سول سوسائٹی خاندان معاشرے کا نعم البدل نہ بن سکی کیوں کہ اس کی بنیاد محبت، قربانی، ایثار اور بے لوث تعلق پر تھی جب کہ سول سوسائٹی کی بنیاد صرف غرض، معاہدے اور خواہش نفس پر رکھی گئی ہے۔ جس کے اندر لوگ صلہ رحمی کی بنیاد پر تعلقات قائم نہ کرتے ہوں بلکہ ان تعلقات سے ماوراء ہو کر غرض کی بنیاد پر متحد ہو جائیں اور ان کی سیاسی زندگی کا مقصد اپنے حقوق کا حصول ہو اور ان کا نعرہ یہ "ہمارے حق ہیں ہمیں دو"۔ ان حقوق کی بنیاد پر آپ ان کو متحد کریں گے تو وہ سرمائے کے بندے بن جائیں گے۔ غرض کی بنیاد پر متحد ہونے والے کبھی غرض کی سطح سے بلند نہیں ہو سکتے اس کے نتیجے میں حاسد، حریص خود غرض معاشرہ تشکیل پاتا ہے جس کے ہر فرد کا دوسرے فرد سے تعلق محض کسی فائدے اور غرض کے لیے ہوتا ہے۔ حقوق کی طلب اور سرمایہ داری کی بالادستی کو قبول کرنا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں حقوق کی سیاست سرمایہ داری کی بالادستی کی سیاست ہے اور کوئی سیاست نہیں اس کو آپ کوئی نام بھی دے لیں۔ جمہوری عمل، مقامیت، سرمایہ داری کے فروغ کے نتیجے میں حقوق، حرص اور حسد کی روش فروغ پاتی ہے اور معاشرہ خواہشات کی اندھی غلامی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

چوتھا باب

مغربی استعمار اور اُمت مسلمہ کی ذمہ داری

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

اس ضمن میں سب پہلی چیز جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے وہ ہے دورِ حاضر کے استعمار کی بنیادی
کمزوری کیا ہے؟ پہلے یہ عرض کر چکا ہوں کہ موجودہ دور میں سرمایہ ریاست کی دست برد سے باہر ہو چکا
ہے ۔چنانچہ سرمایہ جس سطح پر مرتکز ہوتا ہے وہ ہے عالمی سطح ۔اسی لیے اب تقریباً ہر بڑے بازار میں جن
کارپوریشنز کی بالا دستی ہے وہ بین الاقوامی کمپنیاں (Multinational Companies) یا انٹرنیشنل
پبلکس ہیں ۔لیکن سیاسی سطح پر قوت اب بھی قومی ریاستوں میں مرتکز ہے اور قومی ریاست سے اوپر کسی سطح پر
سیاسی قوت کو مرتکز کرنے کی فی الوقت استعمار میں طاقت نہیں لہٰذا اس ناہمواری کو عبور کرنے کے لیے جو
حکمتِ عملی اپنائی گئی ہے وہ بنیادی طور پر استعماری حکمت عملی ہے اس کو سمجھنا ہمارے لیے ضروری ہے ۔جیسا
کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ عالمی،گلوبل سرمائے کو ایک عالمی،گلوبل ریاست کی ضرورت ہے ۔لیکن وہ
عالمی،گلوبل ریاست موجود نہیں ہے ۔سرمایہ ہمیشہ ریاست کے اوپر انحصار (Depend) کرتا ہے ۔
سرمایہ خود قائم نہیں سرمائے کو قائم کرنے والی قوت ریاست کی قوت ہے ۔کیونکہ ریاست ہی قانون اور
قوت منظم کرنے کی اور نافذ کرنے کی اہلیت رکھتی ہے جس کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ بازار کام کرتے ہیں
سرمایہ دارانہ بازاروں میں خود یہ اہلیت نہیں ہے کہ کسی قوت نافذہ کا کام دے سکیں ۔وہ ایک قوت نافذہ کو
متصور (Presume) کرتے ہیں اسی کی پشت پر وہ اپنے نظام کو مرتب کرتے ہیں چنانچہ سرمایہ دارانہ
بازار کے لیے سرمایہ دارانہ ریاست کا وجود لازم ہے ۔

اب عالمی،گلوبل سطح پر جب سرمایہ مرتکز ہو رہا ہے تو سرمایہ ایک عالمی،گلوبل ریاست کا تمنائی
ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک عالمی،گلوبل ریاست قائم ہو مگر عالمی،گلوبل ریاست اس عمل سے پیدا
نہیں ہو پاتی جس عمل کے نتیجے میں قومی ریاست پیدا ہوئی تھی اور اس کے نتیجے میں قومی ریاست نے ایک
جمہوری شکل اختیار کی تھی ۔جمہوری شکل سے مراد یہی کہ اس کا وظیفہ ایک جمہوری شخصیت اور معاشرے کا
قیام تھا ۔اس کمی کو پوری کرنے والی جو واحد قوت اس وقت موجود ہے وہ امریکہ ہے ۔

عالمی سطح پر سرمایہ کی حفاظت کون کرے؟

امریکہ بنیادی طور پر عالمی،گلوبل سرمائے کی محافظ عالمی ریاست ہے لیکن عالمی،گلوبل

سرمائے کے لیے جس قسم کی ریاست کی ضرورت ہے امریکی ریاست کما حقہ اس معیار پر پورا نہیں اترتی۔ امریکہ مکمل طور پر عالمی سرمائے کی ضرورتوں کا تحفظ نہیں کر پاتا اس کی وجہ یہ کہ امریکہ بنیادی طور پر قومی ریاست ہی ہے۔اس کا حدود اربعہ قومی ہی ہے اس کے اندر جو لوگ بسے ہوئے ہیں وہ ایک قوم کے لوگ ہیں۔فی الحقیقت امریکہ ایک قومی ریاست ہے۔لیکن وہ اس وقت ایک عالمی ریاست کا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔وہ گلوبل سرمائے کا پشت پناہ ہے اور عالمی سرمائے کے لیے وہ قوت فراہم کر رہا ہے جس کے نتیجے میں عالمی،گلوبل سرمایہ مارکیٹیں آپریٹ (Operate) کر رہا ہے اور اس طریقے سے کام کر رہا ہے جس کے نتیجے میں سرمایہ عالمی،گلوبل سطح پر مرتکز ہو سکے۔اس کو سمجھنے سے پہلے کہ امریکہ کیا کردار ادا کر رہا ہے اور امریکہ یہ کردار کیوں ادا کر رہا ہے؟ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ریاست سرمائے کی بڑھوتری میں کیا کردار ادا کرتی ہے۔سرمایہ دارانہ نظام کی دو خصوصیات ہیں سرمایہ دارانہ نظام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مارکیٹ میں عدم مساوات (Inequality)ہوتی ہے۔مارکیٹ میں عدم مساوات کیوں ہوتی ہے ؟اس لیے ہوتی ہے کہ لوگوں کے پاس سرمایہ مختلف مقدار میں موجود ہوتا ہے۔چنانچہ جب آپ کسی دوسرے سے معاہدہ(Contract) کرتے ہیں تو فی العمل آپ اس کے برابر کے نہیں ہوتے اس کے پاس آپ سے زیادہ سرمایہ ہوتا ہے یا کم سرمایہ ہوتا ہے۔مارکیٹ میں یا معاشی شعبہ(Sphere) میں آپ کی جو حیثیت ہوتی ہے وہ ایک غیر مساوی معاہد (Contractor) کی ہوتی ہے۔آپ جو معاہدہ کرتے ہیں اس میں آپ کو مساوی(Equal) فرض کیا جاتا ہے لیکن فی الحقیقت آپ سرمایہ دارانہ معاشرت میں برابر کے معاہد (Contracter) یا(Contractee) نہیں ہو سکتے۔مارکیٹ میں عدم مساوات ہوتی ہے۔ریاست میں مساوات ہوتی ہے۔سرمایہ دارانہ ریاست جمہوری ریاست ہوتی ہے اور جمہوری ریاست میں جو آپ کی حیثیت ہے وہ اس سے ماورا ہے کہ آپ کے پاس کتنا سرمایہ ہے کتنا سرمایہ نہیں ہے۔اصولاً مارکیٹ میں عدم مساوات ہوتی ہے اور اصولاً ریاست میں برابری ہوتی ہے۔ اور ریاست کی سطح پر جو مساوات ہوتی ہے اس کی بنیاد پر مارکیٹ کی عدم مساوات کو جواز فراہم کیا جاتا ہے ۔مارکیٹ میں عدم مساوات کو جواز فراہم کرنے کے لیے ریاست میں مساوات کا موجود ہونا ایک ضرورت ہے۔لہٰذا جس وقت سرمایہ دارانہ نظام کا پھیلاؤ بڑھتا ہے تو اس کے جواز(Legitmation) کے لیے ضرورت یہ ہوتی ہے کہ ریاست کی سطح کے اوپر جو مساوات ہے اس کی بھی توسیع کی جائے۔اگر ریاست کی سطح کے اوپر وہ توسیع نہیں کی گئی جس کے نتیجے میں مارکیٹ کی عدم مساوات کو جواز(Justify) فراہم کیا جا سکے۔تو مارکیٹ میں جو عدم مساوات وجود میں آتی ہے اس کا کوئی جواز نہیں،اس کی کوئی توجیہہ نہیں بیان کی جا سکتی کہ کیوں ہم ان نا مساویانہ حالات کو برداشت کریں۔ان نا مساویانہ حالات کو برداشت کرنے کے لیے ہئیتی مساوات(Formal Equality) کو وسعت دینا،ہئیتی مساوات (Formal Equality)کے دائرہ کار کو وسعت (Extend) دینا سرمایہ داری کے تحفظ کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔

ستر لاکھ سرخ ہندیوں کا قتل عام:

ان معنوں میں سرمایہ دارانہ مارکیٹ ریاست کی توسیع کے بغیر کبھی بھی قائم نہیں ہوئی ۔ مثلاً خود امریکہ میں جو حکومت قائم ہوئی ہے جو مارکیٹ قائم ہوئی ہے وہ سرخ ہندیوں (Red Indians) کو تہس نہس کر کے قائم ہوئی ۔ سات ملین (ریڈ انڈین) سرخ ہندی سترھویں صدی سے لے کر انیسوی صدی تک ۔ سات ملین (ریڈ انڈین) سرخ ہندیوں کا قتل عام کیا گیا اور ان کی زمینیں چھینی گئیں ۔ پوری ایک داستان ہے ظلم اور ستم کی ۔ جس کے نتیجے میں پوری ایک نسل کو تباہ کیا گیا جس کی بنیاد پر امریکی مارکیٹ اس براعظم میں قائم (Established) ہوئی ۔ ریاست کی اس بہیمیت اور ریاست کی اس سفاکی اور ظلم کے بغیر سرمایہ داری کے لیے امریکہ کو محفوظ نہیں بنایا جا سکتا تھا ۔

سرمایہ داری مذہب کو بے دخل کرتی ہے:

امریکی تاریخ اس چیز کی گواہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشرت کو قائم رکھنے کے لیے اور سرمایہ دارانہ معیشت کو برقرار رکھنے کے لیے سرمایہ دارانہ ریاست کی توسیع کی ضرورت ہے ۔ اگر سرمایہ دارانہ ریاست کی توسیع نہیں ہوگی تو سرمایہ دارانہ معیشت پھیل نہیں سکتی ۔ اب سرمایہ دارانہ ریاست کی توسیع کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ دستور کے اوپر اجماع ہو ۔ اور وہ جو لوگ بس رہے ہیں وہ سرمایہ دارانہ ریاست کی وسعت کو قبول کریں ۔ رضامندی سے قبول کریں وہ اسے ان معنوں میں قبول کریں کہ وہ اسے حق جانیں ۔ اسے تسلیم کریں اس کو پسند کریں اور اس ریاست کی تنظیم پر وہ صاد کریں ان کی مرضی یہی ہو کہ سرمایہ دارانہ ریاست کی توسیع ہو اور وہ اس کو حق جانیں کہ سرمایہ دارانہ نظم عدل اور سرمایہ دارانہ نظم ملکیت اور سرمایہ دارانہ سیاسی تنظیم عام ہو اور اس کی بنیاد پر معاشرتی اور معاشی زندگی مرتب ہو ۔ مثلاً ان علاقوں میں کہ جہاں سرخ ہندیوں کو قتل کیا گیا تھا ۔ امریکی دستور کے اوپر اجماع ہوا ۔ اور امریکی دستور نے وہی قواعد وضوابط بیان کیے جن کی بنیاد پر ایک سرمایہ دارانہ ریاست قائم ہو سکتی ہے ایسی ریاست مذہب کو سیاست سے بے دخل کر دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ہر انسان اس کا مکلف ہے کہ وہ آزادی کی بڑھوتری کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے اور اس کو ہم وہ حقوق دیں جس کو حقوق انسانی (Human Rights) کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ ۔

سرمایہ داری کے فروغ کے دو طریقے:

سرمایہ دارانہ ریاست کی توسیع کا ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کا اس بات کے اوپر اجماع ہو جائے کہ سرمایہ دارانہ ریاست کا بنیادی وظیفہ اور سرمایہ دارانہ ریاست کی اصل دعوت دراصل حق کی دعوت ہے اور فی الواقع زندگی ہمیں انہی خطوط پر مرتب اور منضبط کرنا چاہیے جو سرمایہ دارانہ تنظیم ریاست بتاتی ہے ۔ دوسرا طریقہ سرمایہ دارانہ ریاست کی توسیع کا وہی طریقہ ہے کہ جس طریقے کے ذریعے سرخ ہندیوں کو ختم کیا گیا یعنی قوت کے استعمال کے ذریعے ۔ جنگوں میں

فتوحات کے ذریعے اس طریقے سے بھی سرمایہ دارانہ ریاست توسیع پاتی ہے آپ جانتے ہیں کہ استعماریت (Colonialism) کا جو عمل سولہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک چلا اور آج بھی موجود ہے سرمایہ دارانہ ریاست کو وسعت دینے کا دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا یعنی قوت دہشت طاقت اور قتل عام کے ذریعے توسیع ۔یہ طریقہ مقبول عام طریقہ ہے ۔امریکہ میں سات ملین ریڈ انڈینز کو قتل کیا گیا اوران کی نسل کشی کی گئی ۔دو ملین قدیم آسٹریلوی باشندوں کو آسٹریلیا میں قتل کیا گیا ۔جہاں اس بڑے پیانے پر قتل وغارت اور لوٹ کھسوٹ ممکن نہ تھی وہاں استبداد کے ذریعے ملکوں پر قبضہ کیا گیا اوراس کے سرمایے کو سرمایہ دارانہ منڈیوں کے تابع بنایا گیا ۔وہاں اپنے مقامی حواریوں کا ایک گروہ تیار کیا گیا جس کے نتیجے میں وہ ریاستیں سرمایہ دارانہ ریاستیں بن گئیں یا سرمایہ داری کی باج گزار ریاستیں بن گئیں ۔ پھر بزورقوت ان کو سرمایہ دارانہ ملکیت اور سرمایہ دارانہ معیشت کے اندر ضم کر دیا گیا ۔یہ دوسرا طریقہ ہے سرمایہ دارانہ ریاست کے پھیلاؤ کا۔ جب تک سرمایہ دارانہ ریاست کی توسیع نہ ہو اس وقت تک سرمایہ دارانہ بازار کی توسیع نہیں ہوسکتی اور سرمایہ دارانہ ریاست کی توسیع کے لیے جمہوری عمل کی وسعت کی کوئی ان معنوں میں ضرورت نہیں ہے کہ لوگ فی العمل ایجاباً اس جمہوری عمل میں شریک ہوں ۔وہ اس کو حق جانیں اور قبول کریں ۔بذریعہ قوت بھی یہ کام ہوسکتا ہے ۔اب اصل میں جس چیز کو عام کرنا سرمایہ داری کے فروغ کے لیے ضروری ہے ۔(امریکہ کے کردار کو سمجھنے کے لیے یہ بات بہت اہم اور ضروری ہے حالانکہ اس وقت یہ بات ذرا مجرد (Abstract) لگتی ہے جو چیز سرمایہ دارانہ سیاسی نظم کو قبول کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جس کے بغیر لوگ سرمایہ دارانہ نظم کو قبول کرنے پہ راضی نہیں ہو سکتے یا سرمایہ دارانہ ریاست کی اس قوت کو قبول نہیں کر سکتے ۔وہ یہ رائے ہے کہ انفرادی سطح پر اقدار کی ترتیب میں جو فرق ہے یہ غیر اہم ہے ۔انفرادی سطح پر اقدار کی ترتیب میں جس فرق کا زندگیوں میں اظہار ہوتا ہے وہ غیر اہم ہے ۔ اسے کہتے ہیں برداشت کا اصول Doctrine of tolerance کیا ہے؟ یہ عیسائیت سے نکلا ہے ۔ جس کے بارے میں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ۔تحریک اصلاح اس اصطلاح کا سرچشمہ (Protestantism) سے نکلا ہے ۔

رواداری کی مغربی اصطلاح کا حقیقی مفہوم:

(Doctrine of tolerance) یہ ہے کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ اقدار کی کیا ترتیب کرتے ہیں آپ کی نگاہ میں اپنی ذاتی زندگی میں خیر کا کیا تصور ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔معاشرتی سطح پر آپ اس چیز کے قائل ہیں کہ ذاتی زندگی میں اقدار کی کوئی بھی ترتیب ہو معاشرتی سطح کے اوپر جو ترتیب آپ قبول کریں گے اور جو فیصل حیثیت رکھے گی وہ وہی ترتیب ہے جس میں آزادی کی بڑھوتری کو مقدم تصور کیا جائے ۔Tolerance کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اختلاف رائے کو برداشت کیا جائے وغیرہ بلکہ اس کا مطلب بنیادی طور پر یہ ہے کہ آپ کی اقدار میں ترتیب کا جو فرق، ترتیب کا جو اختلاف ہے اس کو غیر اہم تصور کریں ۔اس بات کو اہمیت نہ دیں کہ ذاتی زندگی میں آپ نے

خیر کے کس تصور کو اپنایا۔ فی الواقع خیر کیا ہے؟ اس لیے یہ ظاہر ہے کہ خیر کے تصور کو تو بنیادی طور پر انفرادی سطح پر اختیار کیا جاتا ہے۔ آپ اس چیز کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے اور کہیں گے کہ یہ سوال کہ خیر کیا ہے؟ یہ بات ایک مہمل بات ہے یہ ایک غیر اہم بات ہے یہ بے کاری بات ہے۔ معاشرتی سطح پر اس کے اظہار کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں کہ خیر کیا ہے؟ معاشرتی سطح کے اوپر ہم صرف اس چیز کو خیر تصور کرتے ہیں کہ آزادی زیادہ سے زیادہ ہو اور آزادی کے اظہار کی شکل سرمایہ ہے۔ بس باقی یہ کہ خیر کیا ہے۔ ہم اپنے لیے کیا پسند کرتے ہیں؟ کیوں پسند کرتے ہیں؟۔ یہ تمام باتیں لا یعنی باتیں ہیں غیر اہم باتیں ہیں ان سب کو ہمیں بھول جانا چاہیے۔

سرمایہ داری کا سیکولرازم: مذہب کا خاتمہ:

فی الواقع جس نوعیت کا سیکولرازم سرمایہ داری قائم کرتی ہے وہ اس نوعیت کے سیکولرازم سے بالکل مختلف ہے جو عیسائیت قائم کرتی ہے۔ عیسائیت بھی ایک سیکولرازم قائم کرتی ہے جہاں وہ کہتی ہے کہ بادشاہ کا ایک علاقہ ہے اور پادری کا دوسرا علاقہ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن وہ عدم برداشت کے اس تصور کی بالکل قائل نہیں کہ اقدار کی ذاتی ترتیب غیر اہم ہے سرمایہ داری جس نوعیت کا سیکولرازم قائم کرتی ہے وہ اس نوعیت کا سیکولرازم ہے جس کے اندر ذاتی اقدار کی ترتیب کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی۔ اسی لیے اس نوعیت کے سیکولرازم میں مذہب کا پنپنا ممکن ہی نہیں، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ مذہب کی کوئی اہمیت، مذہب کی کوئی افادیت، مذہب کی کوئی حاکمیت، مذہب کا کوئی اظہار معاشرتی اور ریاستی سطح پر سرمایہ برداشت کر سکے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ جس نوعیت کا سیکولرازم وہ قائم کرتا ہے وہ فی الواقع ان معنوں میں سیکولرازم ہے ہی نہیں۔ جن معنوں میں عیسائیت کا سیکولرازم ہے۔ یہ سیکولرازم ان معنوں میں سیکولرازم نہیں ہے کہ جن معنوں میں بادشاہ کو ایک محدود دائرہ اثر [Limited sphere of Influence] اختیار دیا جاتا تھا لیکن بالا دست تصور خیر اور تصور عدل، عیسائی تصور خیر اور تصور عدل رہتا تھا۔ مگر اس وقت انفرادی زندگی میں تصور خیر کو قائم رکھنے کی سرے سے کوئی گنجائش سرمایہ دارانہ نظام میں موجود نہیں۔ وہ ایک مہمل چیز ہے، ایک کھلونا ہے، ایک سجانے کی چیز ہے، ایک دستکاری ہے آپ اگر مسجدوں کو آرٹ کی طرح متصور کریں اور اگر مذہبی زندگی کو ایک نفسیاتی دوا (سائیکالوجیکل میڈیسن) کی طرح متصور کریں تو اس کی اجازت تو موجود ہے مگر جب افغانستان میں بت توڑے گئے تو وہ بہت ناراض ہوئے کیونکہ کسی مذہب کا معاشرتی اظہار ریاستی سطح پر یا ریاستی سطح پر مذہبی اعتقادات عقائد نظریات کے اظہار کی نظام سرمایہ داری میں قطعاً اجازت نہیں۔ اسی کو وہ برداشت کہتے ہیں۔ Tolerance کا یہی مطلب ہے۔ تاریخی طور پر اس کا کوئی اور دوسرا مطلب نہیں ہے۔ Protestentism میں بھی اس کا یہی مطلب تھا اور موجودہ تنویری اور رومانوی تحریک میں بھی اس کا یہی مطلب ہے۔ اس تصور برداشت کا جو اصلی مطلب ہے وہ یہی ہے کہ آپ حقوق انسانی کو بالاتر قدر کے طور پر قبول کریں۔ آپ اس تصور کو کہ فی الواقع انسان الہٰ ہے اور اس کا مقصد وجود سرمائے کی خدمت ہے۔ سرمائے کی خدمت کی بنیاد پر ہی اس کی اضافی

قدر(Relative Value) متعین ہوتی ہے ۔امریکہ کی خاص پوزیشن سرمایہ دارانہ نظام میں یہی ہے کہ امریکہ وہ پہلی اور واحد ریاست ہے کہ جس کے قیام کا مقصد ہی حقوق انسانی کی بالادستی کو قائم کرنا ہے ۔اس کے علاوہ امریکی ریاست یا امریکی قومیت کی کوئی بنیاد نہیں۔

امریکہ کا اعلان آزادی (Declaration of Independence) جو 1776ء میں ہوا ۔فیڈرلسٹ پیپرز اور امریکی دستوریتیوں کے تینوں اسی فلسفہ بر داشت کے غماز ہیں ۔ان معنوں میں سرمائے کی پہلی ریاست اور وہ ریاست جو ہمیشہ سرمائے کی عقلیت کے فروغ سے وفادار رہی ،اور سرمائے کے فروغ کو اپنا منصب اعلیٰ تصور کرتی رہی وہ امریکہ ہے اور ایسی کوئی ریاست کبھی قائم نہیں ہوئی ۔فرانسیسی ریاست تک کے بارے میں آپ یہ بات نہیں کہہ سکتے ۔فرانسیسی ریاست میں انقلاب فرانس کے بعد نپولین تک ایک پورا دور گزرا ،اس کے بعد پھر بونا پارٹ کی واپسی بھی ہے ۔لوئی نپولین کا دور بھی ہے اور بہت سے تضادات ہیں ۔فرانس کے اندر آمریت بھی قائم ہوئی اور کوئی دوسری ریاست دنیا میں ایسی نہیں ہے کہ جس کے بارے میں یہ بات کہی جا سکے کہ سرمائے کی بالادستی کو اس نے اپنے مقصد وجود کے طور پر قبول کر لیا ہو ۔اب ہو سکتا ہے کہ اور ریاستیں بھی یہی کام کریں لیکن تاریخی طور پر سرمائے کی اکیلی ایک ہی ریاست رہی ہے اور وہ ریاست ہے امریکہ ۔اس لیے ہیگل کو سب سے زیادہ جو توقع تھی مغربی تہذیب کی بالادستی کے بارے میں وہ اپنے ملک سے نہیں تھی امریکہ سے تھی ۔حالانکہ اس وقت امریکہ ایک نہایت پس ماندہ ملک تھا ۔اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں امریکہ کی کیا حیثیت تھی ۔1820ء 1830ء میں امریکہ کی کیا حیثیت تھی ۔امریکہ وہ ملک ہے جو صرف اور صرف سرمائے کے لیے تعمیر شدہ ریاست ہے ان معنوں میں اکیلی ریاست ہے جس نے Doctrine of tolerance کو اپنا دستور بنایا اور دنیا کے جتنے دساتیر ہیں امریکی دستور ہی کی ایک تعبیر و تفسیر (Reinterpretation) ہیں ۔جتنے دستور بھی بعد میں بنے وہ سب امریکی دستور ہی کی تعبیر و تفسیر اور یہاں تک کہ آپ دیکھیں 1948ء میں اقوام متحدہ نے جو اعلان حقوق انسانی (Declaration of Human Rights) جاری کیا اسے امریکی صدر کی بیوی الیرنور روز ویلٹ (Elearno Rosevelt) نے لکھا تھا۔

دستور نے انجیل کی جگہ لے لی:

ان معنوں میں امریکہ کی پوزیشن ایک خاص پوزیشن ہے ۔ان معنوں میں خاص پوزیشن ہے کہ یہ سرمائے کی پہلی ریاست ہے ۔چنانچہ جس نوعیت کی شخصیت وہاں تعمیر ہوئی ہے وہ بھی ایک منفرد شخصیت ہے اس کے اندر یہ بالکل ایک فطری بات ہے کہ وہ انجیل کی جگہ دستور کو رکھے جو چیز امریکی تہذیب اور معاشرے اور معیشت میں بالادست ہے وہ امریکی دستور ہے امریکی دستور غیر متنازعہ فیہ ہے تمام فیصلے دستور ہی کی بنیاد پر ہوتے ہیں ۔دستور کے سوا کوئی چیز بالادست نہیں کسی کو دستور پر فوقیت حاصل نہیں اور دستور کے سوا ہر چیز ،ہر بات متنازعہ ہو سکتی ہے ،دستور غیر متنازعہ ہے ۔پچھلے انتخابات میں جارج

بش کی کامیابی اکثریتی ووٹوں کی بنیاد پر نہیں ہوئی، اکثریتی ووٹ تو دوسرے امیدوار کو پڑے تھے۔لیکن دستور اور سپریم کورٹ کا فیصلہ سب کو قبول کرنا پڑا۔یہ نہیں ہوا کہ تنازعہ آخر کار عوام کی عدالت میں پیش ہوا ہو، ایسا نہیں ہوا۔وہ گیا عدالت میں ہی اور عدالت کا فیصلہ سب نے مانا، ہارنے والے نے بھی مانا اور جیتنے والے نے بھی مانا۔عوام نے بھی مانا۔اس لیے کہ دستور کی پابندی پر سب کا ایمان ہے۔دستور سب کے لیے مقدس ہے۔دستور نے انجیل کی جگہ لی ہے دستور نے انجیل کو رد کیا ہے۔ان معنوں میں امریکہ سرمائے کی ریاست ہے۔ہاں قومی ریاست بھی ہے۔لیکن قومی ریاست بعد میں ہے۔سرمایے کی ریاست پہلے ہے کیوں؟اس لیے کہ جس شخصیت کی اس نے تعمیر کی ہے یہ وہ شخصیت ہے جو سرمائے کی بالا دستی کو قبول کرتی ہے اور اپنی تاریخی شناخت ہی اسی قبولیت برتری سرمائے سے اخذ کرتی ہے۔امریکہ کی ریاست کی بنیاد ہی امریکی دستور ہے اس سے پہلے کی تاریخ امریکہ کے لیے استعماری تاریخ ہے اور ایسی تاریخ ہے جسے وہ رد کرتے ہیں ان کی تاریخی شناخت یہ ہے کہ وہ سرمائے کے بندے ہیں یہ ان کی تاریخی شناخت ہے۔ان معنوں میں فی الواقع ایک منفرد ریاست ہے۔

قومی اور عالمی سرمایہ اور ریاست کا تعلق:

چنانچہ امریکہ کی دو حیثیتیں ہیں۔امریکہ کی پہلی حیثیت یہ ہے کہ وہ سرمائے کی ریاست ہے۔اور دوسری یہ ہے کہ وہ قومی ریاست ہے۔جس وقت سرمایہ قومی سطح پر مرتکز ہوتا تھا اس وقت تک ان دونوں حیثیتوں میں کوئی تضاد نہیں تھا۔وہ بیک وقت سرمائے کی ریاست اور قومی ریاست کی حیثیت رکھتی تھی۔لیکن جس وقت سرمایہ دارانہ نظام میں یہ بنیادی تضاد پیدا ہوا کہ سرمایہ عالمی سطح پر مرتکز ہونے لگا اور ریاستی قوت قومی سطح پر مرتکز رہی تو یہ ایک تضاد پیدا ہو گیا۔امریکہ سرمایے کی ریاست کی حیثیت سے جن اعمال کا مکلف تھا یا امریکہ کو جو فرائض بحیثیت سرمائے کی ریاست کے ادا کرنے پڑتے ہیں وہ فرائض ان فرائض سے متصادم ہیں جن فرائض کو اسے بحیثیت قومی ریاست ادا کرنا ہے چونکہ ریاست کی سطح پر لوگ ہیئتی (Formally) اعتبار سے برابر ہیں اس لیے جس وقت بھی امریکہ ایسے فرائض ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو عالمی سرمائے کی بڑھوتری اور فروغ کے لیے ضروری ہیں تو اس عمل کی تصدیق اسے اپنے ان ہیئتی (Formally) اعتبار سے برابر ووٹر سے لینی پڑتی ہے۔چونکہ یہ Formally Equal ووٹرز بنیادی طور پر اپنی غرض کی بنیاد پر متحرک (Motivate) ہوتے ہیں اور امریکی قوم پرستی ان معنوں میں کوئی قوم پرستی نہیں ہے جن معنوں میں جرمن قوم پرستی ہے یا تھی یا جاپانی قوم پرستی ہے۔امریکی قوم پرستی تو وہ قوم پرستی ہے جو مشروط ہے سرمائے کی بڑھوتری کے ساتھ۔لہٰذا جس وقت بھی امریکی ریاست اپنے عوام سے اس بات کی تصدیق چاہتی ہے کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جو سرمایے کی بڑھوتری کے لیے لازم ہے تو اسے یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ یہ عمل امریکی عوام کے اغراض اور فائدے میں ہے۔ امریکی قومیت، جرمن قومیت یا جاپانی قومیت نہیں ہے۔لہٰذا امریکی ریاست کا یہ تضاد ہے۔قومی ریاست کی حیثیت سے اسے ہمیشہ اپنے ان اعمال کی تصدیق عوام سے کرانا پڑتی ہے۔جو وہ سرمایہ کی عالمی بڑھوتری کے لیے

انجام دیتی ہے۔اورعوام صرف اس صورت میں توثیق کرتے ہیں جب یہ واضح اور ظاہر ہو کہ اس عمل کے نتیجے میں ان کی اغراض پر آنچ نہیں آئے گی۔مثلاً سب سے بڑی ضرورت اس وقت عالمی سرمائے کی یہی ہے کہ جمہوری ریاست کو عام کر دیا جائے۔جمہوری ریاست کو عام کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہر آدمی ووٹ دے۔امریکہ کا صدر امریکہ ہی میں کیوں منتخب ہو۔امریکہ کا صدر پوری دنیا منتخب کرے۔امریکہ قومی ریاست کیوں رہے امریکہ بین الاقوامی ریاست بن جائے۔امریکہ کم از کم اگر عالمی ریاست نہ بھی بنے تو ورلڈ فیڈریشن کی شکل ہی اختیار کر لے۔سرمائے کی ضرورت یہ ہے کہ امریکہ کے اندر زیادہ سے زیادہ آزاد اور کھلی معیشت ہو اور دنیا میں ایسی کوئی دوسری معیشت نہ ہو۔آسانی سے کم قیمت (Cheapest) لیبر امریکہ جا سکے سب سے زیادہ باصلاحیت لوگ امریکہ میں ملازمت پاسکیں وغیرہ وغیرہ۔لیکن یہ تمام چیزیں نافذ العمل نہیں ہیں۔کیوں نافذ العمل نہیں ہیں؟ اس لیے کہ ان چیزوں کو عملی جامہ پہنانے کے نتیجے میں وہ جو مساوی شہریت کا دائرہ ہے وہاں آپ ثابت نہیں کر سکتے کہ تمام چیزیں امریکی شہریوں کے مفاد میں ہیں۔اگر سب لوگوں کو اس چیز کا حق دیا جائے کہ وہ امریکہ کے صدر کو منتخب کریں تو آپ امریکی شہریت کو عالمگیر کر دیں گے اور امریکی شہریت کے جو حقوق ہیں ان کو بھی عالمگیر (Universalize) کر دیں تو وہ فوائد جو امریکی شہریت کے امریکیوں کو ملتے ہیں تمام دنیا کے افراد کو ملنے لگیں گے۔بھلا وہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں وہ لوگ جو سالہا سال سے امریکہ جا کر آباد ہوتے ہیں ان کو بھی شہریت نہیں ملتی۔کیوں نہیں ملتی؟ عالمی ریاست کا تو یہی تقاضا ہے کہ سب کو امریکہ کا شہری بناؤ اس لیے کہ سرمائے کی اکیلی ریاست ہے۔

سرمائے کی مجبوریاں:

لیکن سرمائے کی یہ مجبوری ہے کہ وہ اپنی وسعت صرف اغراض تک محدود کر دیتا ہے سرمائے کی بڑھوتری کے لیے کوئی قربانی نہیں دیتا۔سرمایہ کا بندہ حرص، حسد و ہوس کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکتا۔یہ ممکن ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ سرمایہ تو نفس کو کثیف کرتا ہے۔قربانی اور ایثار ان تمام چیزوں کی نفی ہے۔لہٰذا امریکی ریاست کی یہ جو حیثیت ہے کہ وہ دنیا میں بالادست ریاست ہو سرمائے کی ریاست ہو اس کی بالادستی تسلیم کی جائے یہ ایک ایسا امکان (Potential) ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے اندر قابل حصول نہیں ہو سکتا۔یا اگر ہو سکتا ہے تو محدود طریقے سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ ذاتی اغراض عالمی بالادستی امریکی شہری کے لیے صرف اس وقت تک قابل قبول ہے جب تک اس کی اپنی اغراض اس سے متصادم نہ ہوں۔یا جب اس کی اغراض اس سے مجروح نہ ہوں۔مثلاً امریکہ کوئی بڑی زمینی جنگ نہیں لڑ سکتا۔ویت نام کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ امریکہ کے اندر یہ اہلیت ہی نہیں ہے کہ وہ کوئی بڑی زمینی جنگ لڑ سکے۔بڑی زمینی جنگ لڑنا تو درکنار اگر کوئی ایسی جنگ برپا ہو جائے جس کے نتیجے میں وال اسٹریٹ کے کریش ہونے کا خطرہ ہو امریکہ اس جنگ کو بند کرنے کے لیے اپنی پوری قوت لگا دے گا تو امریکہ دنیا کی طاقتور ترین ریاست ہونے کے باوجود ایک نہایت کمزور ریاست ہے۔جس کے اندر یہ

صلاحیت ہی نہیں کہ وہ بین الاقوامی بڑی زمینی جنگ لڑ سکے ۔کیوں؟ اس لیے کہ جس قربانی کا قومیت کی بنیاد پر اور عیسائیت کی بنیاد پر یورپ اظہار کرتا رہا اب وہ اس کا اظہار کرنے سے قاصر ہے ۔کسی چیز کے لیے بھی یورپی، امریکی عوام قربانی دینے کے لیے تیار نہیں ۔اسی لیے جو اصلی ہتھیار ہے مغربی تہذیب کے خلاف وہ موت کی دہشت اور زندگی کے خاتمے کا خوف ہے وہ سمجھتے ہیں کہ زندگی یہی ہے یہ ختم ہوئی تو تمام لذتیں ختم ہو گئیں، اس فانی زندگی کو کیسے لافانی بنایا جائے ، اس کا ذریعہ صرف عیش وعشرت کی فراوانی ہے، اس لیے مغرب ، امریکا اور یورپ میں لوگ مرنے کے لیے آمادہ نہیں کیوں کہ آخرت کا کوئی تصور نہیں زندگی ہی سب کچھ ہے لہٰذا جنت ارضی کی نعمتوں سے دست بردار ہونے کے لیے کوئی تیار نہیں جدید ترین اسلحہ اسی بنیاد پر تیار کیا جا رہا ہے کہ افرادی قوت کے استعمال کا متبادل تیار کیا جائے زمینی جنگ کے بجائے بٹن کے ذریعے جنگ کی جائے اور ہزاروں میل دور سے ہدف کو نشانہ بنایا جائے کیوں کہ امریکی و مغربی معاشرت موت کی تلخی جھیلنے کے لیے آمادہ نہیں ۔وجہ یہ ہے کہ معاشرت اور زندگی کی بنیاد لذت اور حصول لذت پر منحصر ہے ۔وہاں تو پورا تعلق ہی اس دنیا میں لذت کے اضافے سے ہے ۔زندگی ختم ہو گئی تو اس سیاست کا پورا تعقل/ وجہ جواز تحلیل ہو گیا، ختم ہو گیا ۔انیسویں صدی کی برطانیہ کی سیاست کو خاص کر اگر آپ دیکھیں گلیڈسٹون کی سیاست کو، پامسٹن کی سیاست کو، ڈیزیلی کی سیاست کو دیکھیں اور موجودہ امریکی صدور کی سیاست کو دیکھیں تو یہ ان کے مقابلے میں بونے نظر آتے ہیں ۔حتیٰ کہ نکسن اور جانسن بھی ان کے مقابلے میں بونے نظر آتے ہیں ۔فی الواقع یورپ کے قدیم فکر سے متاثر افراد ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔کیونکہ جس نوعیت کی اولوالعزمی استعماریت کی بالادستی کے لیے چاہیے وہ امریکہ میں موجود نہیں ۔اس کی وجہ یہ کہ جس نوعیت کی ریاست امریکہ نے تعمیر کی ہے اس نوعیت کی ریاست اس کی اجازت نہیں دیتی کہ آپ لوگوں کو قربانی دینے کی طرف بلائیں ۔آپ جس چیز کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں وہ ان کے حقوق اور اغراض کی تکمیل ہے اور اس کی بنیاد کے اوپر وہ آپ کا ساتھ اسی وقت تک دے سکتے ہیں جس وقت تک آپ بتائیں کہ اسی موجودہ زندگی میں جو راہ وہ اختیار کر رہے ہیں وہ ایسی راہ ہے جس سے ان کی لذت اور افادیت میں اضافہ ہوگا ۔

بیوروکرائزیشن آف ہائی پالیٹکس:

اب اس کمزوری سے نبرد آزما ہونے کے لیے جو حکمت عملی اختیار کی گئی ہے اسے کہتے ہیں اعلیٰ سیاست کو بیوروکریسی کے سپرد کر دینا (Beaurocratization of High Politics) ۔اس سے ہماری کیا مراد ہے؟ اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ کے ماتحت ایسے ادارے قائم کیے گئے جو ان فیصلوں کو جو پہلے ریاستیں سیاسی اجماع کی بنیاد پر کرتی ہیں ان فیصلوں کو وہ ٹیکنیکل بنیادوں پر کرتے ہیں ۔مثلاً کس نوعیت کی معاشی پالیسی ہونا چاہیے ۔ پہلے یہ فیصلہ قومی سطح پر مختلف جمہوری جماعتوں کے منشوروں میں تضادات اور اختلافات کی بنیاد پر عوام کے چناؤ سے ہوتا تھا۔

کس نوعیت کی پالیسیاں ہونی چاہئیں ۔کیا بینکوں کو نیشنلائز کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے؟ کس قسم کی صنعت کو فروغ دینا چاہیے وغیرہ ۔تمام فیصلے اس بنیاد پر ہوتے تھے کہ ایک جمہوری جماعت ایک بات کہتی تھی دوسری جمہوری جماعت دوسری بات کہتی ہے یہ جو منشور تھے یہ بہت مختلف ہوا کرتے تھے ۔لیبر پارٹی کا منشور کنزرویٹو پارٹی کے بالکل الٹ ہوتا تھا ۔عوام جو تھے وہ یا لیبر پارٹی کو منتخب کرتے تھے یا کنزرویٹو پارٹی کو منتخب کرتے تھے ۔اگر کنزرویٹو پارٹی کو منتخب کرتے تھے تو پھر بینکوں کو نیشنلائز نہیں کیا جاتا تھا ۔مالیاتی سیکٹر کو ترقی دی جا سکتی تھی ۔مگر پیداواری سیکٹر کو ترقی نہیں دی جاتی تھی ۔اگر لیبر پارٹی کو منتخب کرتے تھے تو بینکوں کو نیشنلائز کیا جاتا تھا۔ مالیاتی (فنانس) سیکٹر کو ترقی نہیں دی جاتی تھی پیداواری (Manufacturing) سیکٹر کو ترقی مل جاتی تھی وغیرہ ۔اب یہ تمام فیصلے کہ معاشی پالیسی کسی ملک کی کیا ہو گی ٹیکنیکل بنیادوں پر کیے جاتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ ریاست کے لیے نظم و ضبط کا نیا تانا بانا:

اب یہ کہا جاتا ہے کہ بنیادی مقصد معاشی پالیسی کا سرمائے کی بڑھوتری ہے اور اس پہ سب کا اجماع ہے کہ ہم سرمائے کی بڑھوتری چاہتے ہیں ۔سرمائے کی بڑھوتری کس طریقے سے ہو گی یہ ٹیکنیکل بات ہے، سیاسی بات نہیں ہے ۔سرمائے کی بڑھوتری کیسے ممکن ہو گی کسی خاص ملک میں اس کا جواب دینے کے لیے ہم نے ایک سائنس بنا لی ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ یہ کیسے ہو گا، اس سائنس کا نام ہے اکنامکس ۔وہ بتاتی ہے کیا کیا ٹیکنیکل ضرورتیں ہیں کہ جن کو اگر آپ پورا کریں تو آپ کے ہاں سرمائے کی بڑھوتری ممکن ہو گی ۔کون سب سے اچھے طریقے سے یہ خدمت انجام دے سکتا ۔یہ ایک خاص ٹیکنیکل ایجنسی ہے جو یہ بتا سکتی ہے سرمائے کی بڑھوتری کب پوری ہو گی جب آپ کی پالیسیاں کون کون سی ہوں گی وغیرہ وغیرہ ۔وہ ٹیکنیکل ایجنسی کون سی ہے؟ وہ ٹیکنیکل ایجنسی ہے IMF ۔ورلڈ بینک ، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن وغیرہ ۔چنانچہ یہ جتنے اشوز جو پہلے بالکل جمہوری سیاست کی اصل تھے وہ اشوز کہ جو پہلے ڈیموکریٹک پالیٹکس کی جان تھے وہ غیر سیاسیائے (Depoliticize) گئے ہیں یا کیے جا رہے ہیں اور انہیں غیر سیاسی بنانے کے لیے جو ایجنسیز قائم کی گئیں ۔وہ یہی اقوام متحدہ اور اس کے حلیف ادارے ہیں جیسے کہ IMF، ورلڈ بینک اور WTO وغیرہ وغیرہ ۔یہی عمل دفاعی سیکٹر میں بھی جاری ہے ۔یہ بات کہ آپ عالمی سرمائے کی بڑھوتری کس طریقے سے ممکن بنا سکتے ہیں یہ محض ایک معاشی بات نہیں بلکہ عالمی سرمائے کی بڑھوتری کو ممکن بنانے کے لیے آپ کو سیاسی استحکام کی بھی ضرورت ہے ۔سیاسی استحکام اگر آپ کو حاصل کرنا ہے تو آپ کو اسی نوعیت کی دفاعی پالیسی بھی اختیار کرنا پڑے گی جس کے نتیجے میں سرمایہ اپنے آپ کو آپ کے ملک میں محفوظ سمجھ سکے ۔چنانچہ یہ بھی ایک ٹیکنیکل بات ہے کہ آپ کس نوعیت کی دفاعی پالیسی اختیار کریں گے۔

الغرض آپ اگر سرمائے کی بڑھوتری پر متفق ہیں تو پھر معاشرتی شعبہ میں بھی آپ کو اسی قسم کی Technologization نظر آئے گی، صحت کے معاملے میں بھی ۔مثلاً پاپولیشن کنٹرول جو ہے وہ

آپ کے لیے ضروری ہے کہ اگر پاپولیشن کنٹرول نہیں کریں گے تو آپ کے ملک میں آبادی بہت بڑھ جائے گی اس کے نتیجے میں سرمایہ جو ہے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔ ماحول(Environment) کے میدان کے اندر بھی اگر آپ چاہتے ہیں کہ سرمایہ کاری ہو تو ماحول کے ضمن میں بھی کچھ خاص پالیسیوں کو اپنانے کی ضرورت ہوگی۔ وسائل کے استعمال کے ضمن میں بھی یہی بات صادق آئے گی آپ کو ایسے قانون بنانے پڑیں گے اور ان کی بالادستی قبول کرنا ہوگی۔ Law of Sea سمندری وسائل کے استعمال کے لیے سمندری قوانین ہیں جن کو مان کر سرمایہ کی بڑھوتری کا امکان وسیع ہوگا۔

UNO اور عالمی ادارے کون قائم کرتا ہے؟

الغرض سرمائے کی بالادستی کو بحیثیت مجموعی پوری عالمی معیشت پر جاری کرنے اور مستحکم رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے اس کا طریقہ ان ایشوز کی Technologization ہے کہ جو پہلے سیاسی اشوز تھے۔ اور یہ technologization وہ ادارے ممکن بنا رہے ہیں جو بنیادی طور پر اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے ہیں۔ اور اقوام متحدہ کی پشت پر اور ان ذیلی اداروں کی پشت پر کون سی قوت موجود ہے، وہ صرف امریکہ کی قوت۔ چنانچہ وہ کام جو امریکہ کو سیاسی قوت کے استعمال کے نتیجے میں بلاواسطہ کرنا چاہیے تھا بحیثیت ایک عالمی ریاست کے، وہ کام اقوام متحدہ کی ایجنسیوں کے ذریعے ٹیکنیکل طور پر کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سرمائے کی بڑھوتری کے لیے عالمی سطح پر جس تنظیم کی ضرورت ہے وہ تنظیم اقوام متحدہ فراہم کرتی ہے۔ لیکن اقوام متحدہ اور اس کی ایجنسیاں خود قوت والی چیز نہیں ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ ان کے پاس کوئی قوت ہے نہ وہ کوئی جمہوری ادارے ہیں ان معنوں میں کہ ان اداروں کا کوئی جمہوری جواز ہو، ان کی کوئی جمہوری حیثیت ہو۔ ان کی کوئی جمہوری حیثیت نہیں ہے کسی نے بھی اقوام متحدہ کے اداروں کو منتخب نہیں کیا ان کے پیچھے جو جمہوری قوت ہے وہ امریکہ ہی کی قوت ہے ان معنوں میں ہم یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ یہ IMF، ورلڈ بینک وغیرہ سب امریکی ادارے ہیں نہ صرف یہ بلکہ پرائیویٹ سیکٹر کے جو سٹینڈرڈ سیٹنگ ادارے ہیں مثلاً انٹرنیشنل اکاؤنٹنگ باڈیز، ISO 9000 اور 9002 کے سٹینڈرڈ بنانے والے ادارے۔ ماحول اور کوالٹی کنٹرول کے ادارے وغیرہ یہ سب امریکی ادارے ہیں۔

اور سرمایے کی پشت پر امریکہ ہے۔ چاہے وہ سرمایہ ملیشیا سے آئے چاہے وہ سرمایہ سعودی عرب سے آئے چاہے وہ سرمایہ لاطینی امریکہ سے آئے۔ اس کی پشت پر جو سیاسی جمہوری قوت ہے وہ امریکہ کی قوت ہے۔ دوسری کوئی قوت موجود نہیں سرمائے کی پشت پر جو سیاسی جمہوری قانونی (Legitimate) قوت موجود ہے وہ امریکہ کی قوت ہے اسی لیے ہر سرمایہ کار چاہے وہ پاکستانی سرمایہ کار ہو، چاہے وہ ملائی سرمایہ کار ہو چاہے وہ فرانسیسی سرمایہ کار ہو کوئی بھی ہو جب آپ اس سے پوچھیں تمہیں ہمارے ملک میں سرمایہ کاری کے لیے کس قسم کی پالیسیوں کی ضرورت ہے وہ کہتا ہے اس قسم کی پالیسیوں کی جن کی IMF تصدیق کرے۔ کیوں؟ اس لیے کہ IMF کی تصدیق بنیادی طور پر اس بات کا اظہار ہے کہ یہ وہ پالیسیاں ہیں کہ جس سے سرمائے کی عالمی بڑھوتری کو تقویت ملتی ہے اور یہ وہ پالیسیاں ہیں جن کے نتیجے میں امریکہ کی

سیاسی قوت کو استحکام ملتا ہے ۔لہٰذا سرمائے کی پشت پر جو قوت ہے وہ امریکی ریاست کی قوت ہے ۔لہٰذا ہم اس متضاد صورت حال میں ہیں کہ سرمایہ تمام ریاستوں کو کمزور کرتا ہے لیکن امریکہ کی ریاست کی قوت میں اضافہ اس کی ضرورت ہے اگر امریکی ریاست کی قوت متزلزل ہو جائے ،اگر امریکی ریاست کی قوت کہیں سے بے دخل کر دی جائے تو سرمایہ وہاں نہیں رہے گا ،سرمایہ وہاں غیر محفوظ ہو جائے گا ۔لہٰذا ہم جس وقت یہ کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب سے مقابلہ فی الواقع امریکہ سے مقابلہ ہے تو ہم کسی نسلی تعصب کی بنیاد پر یہ بات نہیں کہتے ۔ہم کوئی اس بنیاد پر یہ بات نہیں کہتے کہ ہمیں کوئی امریکی عوام سے بغض ہے یا امریکیوں سے کوئی نفرت یا کوئی ایسی چیز ہے جو ہم معاف نہیں کر سکتے وغیرہ وغیرہ ۔ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔بات یہ ہے کہ سرمائے ہی نے امریکی ریاست کو تعمیر کیا ہے اور سرمایے کی پشت پناہی امریکی ریاست کرتی ہے اپنی اس کمزوری کے باوجود اس کو سرمایے کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے اپنے عوام سے ہمیشہ ایک اجازت لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اجازت ہمیشہ مشروط ہوتی ہے اس بات سے کہ سرمائے کی بڑھوتری کے لیے انہیں کوئی قربانی نہ دینے پڑے یا بہت کم قربانی دینے پڑے ۔حالانکہ ایسے لوگ بھی امریکہ میں موجود ہیں ۔مثلاً ایک بہت مشہور مفکر ہے جس کا نام ہے نوم چومسکی وہ کہتا ہے کہ نہیں اصل میں تو امریکی ریاست پر سرمایہ ان معنوں میں قابض ہو گیا ہے کہ یہ امریکی عوام کے لیے مضر ہے اور فی الواقع امریکی عوام کو سرمایہ دھوکہ دیتا ہے امریکہ جو قربانیاں دیتا ہے سرمائے کی بالادستی کے حصول کے لیے وہ اس کے حق میں نہیں ہے ۔اس کے مطابق سرمایہ جمہوریت کو امریکہ میں ختم کر رہا ہے تو ایسے مفکرین بھی موجود ہیں جو اس نوعیت کی بات کرتے ہیں ۔لیکن ان مفکرین کو کسی بھی سطح پر پذیرائی حاصل نہیں ہے کیونکہ سرمایہ داری کی الوہیت پر اجماع ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ امریکی ریاست سرمائے کی ریاست ہے اور سرمائے کے پیچھے جو قوت نافذہ ہے وہ امریکہ کی قوت نافذہ ہے ۔ہمارا اصل مقابلہ سرمایہ داری سے ہے سرمایہ داری کے مذہب سے ہے جو وحی الٰہی کی جگہ لینا چاہتا ہے اور یوروپ میں جگہ حاصل کر چکا ہے ۔سرمائے سے ہم حرص وحسد اور نفس کو پراگندہ کرنے والی وہ روح خبیثہ مراد لیتے ہیں جس کے نتیجے میں تمام دنیا سے مذہب کو بے دخل کرنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے اور جس کے نتیجے میں دنیا جہنم بن رہی ہے ۔اب دنیا میں جہنم تعمیر کرنے کی یہ جو تحریک ہے اس کا بھی اظہار سب سے زیادہ امریکہ ہی میں ہوتا ہے ۔امریکہ ہی میں سب سے زیادہ اس عمل کا ثبوت ملتا ہے کہ سرمائے کی بالادستی جس وقت قائم ہوتی ہے تو فی الواقع کس نوعیت کا معاشرہ تعمیر ہوتا ہے ۔اب اس سلسلے کے صرف چند حقائق میں آپ سے عرض کروں گا سب سے پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ خود امریکہ کا قیام شاید تاریخ انسانی کے سب سے بڑے ظلم کا نتیجہ تھا ۔7 ملین سرخ ہندی بالترتیب دو صدیوں تک قتل ہوتے رہے اور پوری ایک نسلِ انسانی کی بیخ کنی ریاستی ایماء پر کی گئی ۔اس کی نظیر فی الواقع منگولوں اور تاتاریوں کے ہاں بھی شاید اس حد تک نہ ملتی ہو جیسے امریکہ میں ہوا اور ایک پورے براعظم کو لوٹا گیا اور ایک پورے براعظم سے ایک پوری انسانیت کو بے دخل کر کے اس کے اوپر قبضہ کیا گیا اس سے بڑا ظلم شاید تاریخ انسانی میں نہیں ہوا ۔

سرمایہ دارانہ ریاست کے جرائم:

امریکہ دنیا کی واحد ریاست ہے جس کی بنیادوں میں ۷۰ لاکھ انسانوں کا خون شامل ہے جنھیں صرف اس بات پر قتل کیا گیا کہ یہ وحشی درندے ہیں انسان کہلانے کے مستحق نہیں پھر خود اس وقت امریکا کی جو معاشرتی حالت ہے اس کو بیان کرنے کے لیے میں نے Department of Justice سے جو اعداد وشمار جمع کیے ہیں ان سے ان کی معاشرتی حالت کا پتہ چلتا ہے۔اس وقت امریکہ میں 2 ملین قیدی ہیں اور شرح آبادی کے لحاظ سے امریکہ میں قیدیوں کی تعداد دوسرے مغربی ممالک کے مقابلے میں آٹھ گنا زیادہ ہے۔دو ملین افراد قید میں ہیں 4 ملین افراد وہ ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں Probationیا کسی نہ کسی تادیب کے مستحق ٹھہرائے گئے ہیں۔مجموعی سفید نسل کی آبادی میں سے 1% مرد اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی جیل میں جاتے ہیں کالوں میں یہ تعداد 33% ہے۔33% کالے مرد اپنی زندگی میں کسی نہ کسی وقت کسی جرم کا لازماً شکار ہوتے ہیں۔

سرمایہ داری میں جرائم صنعت بن جاتے ہیں:

محکمہ عدل امریکا کی شماریات کے مطابق 50% کے قریب اسکول جانے والے بچے منشیات کو استعمال کرتے ہیں امریکہ کی پولیس صرف 3% جرائم کو عدالتوں تک لا سکتی ہے۔سنگین جرائم کے مرتکبین میں سے محض 3% سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔اس وقت امریکا میں جرم ایک صنعت (Industry) بن گیا ہے۔اس وقت امریکہ کی 1/4 آبادی کسی نہ کسی شکل میں جرائم کے فروغ سے فائدہ اٹھاتی ہے۔280 ملین امریکی آبادی میں سے 67 ملین کسی نہ کسی طور پر جرم سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔جرائم کے نتیجہ میں ان کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے امریکہ کی جرائم کی صنعت کے فروغ کے نتیجے میں پوری معاشرت ایک مجرمانہ معاشرت کی شکل اختیار کر گئی ہے اور ہمیں،اس نوعیت کی انفرادیت کو فروغ دینے کے جو نتائج ہوتے ہیں خود امریکی معاشرے کے اندر نظر آتے ہیں۔لہٰذا اگر ہم سرمائے کی بڑھوتری کے اوپر اپنے آپ کو مجبور سمجھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمائے کی بڑھوتری کو معاشرتی زندگی کا واحد مقصد سمجھ لینا فی الواقع اوصاف رذیلہ کو فروغ دینے کے سوا کچھ نہیں اور معاشرے کو اس طریقے سے مرتب کرنے کے سوا کچھ نہیں کہ جس میں سرمائے کی بندگی عبدیت رب کی جگہ لے سکے لہٰذا سرمایہ داری سے اور اس کے محافظوں سے ہمارا مقابلہ ان بنیادوں پر نہیں ہے کہ وہ کوئی خاص حادثاتی واقعات ہیں جن کی بنیاد پر ہم سرمایہ داری اور اس کے حلیفوں اور پشت پناہ کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی مکالمے،یا کسی افہام وتفہیم کی بنیاد پر ہم کسی ایسی مفاہمت تک پہنچ سکتے ہیں جس کے نتیجے میں بقائے باہمی کے اصولوں کے تحت وہ ہمارے اصولوں کی قدر کو بھی مانے اور ہم اس کے اصولوں کی قدر کو بھی مانیں یہ امید کہ سرمایہ داری کے ساتھ کوئی بقائے باہمی ممکن ہے ایک غیر تاریخی اور غیر حقیقی خیال ہے اور سرمایہ داری کی تاریخ تہذیب فلسفہ اور حقیقت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

کیا مکالمہ......افہام و تفہیم ممکن ہے؟

بنیادی طور پر جو لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ افہام و تفہیم کی بنیاد پر مغرب، سرمایہ داری اور سرمایہ داری کی پشت پناہ اور حلیف طاقتوں کے ساتھ آپ کوئی مصالحت کر پائیں گے تو فی الواقع وہ سرمایہ داری کی تاریخی حیثیت اور سرمایہ دار معاشروں کی ماہیت اور اس کی خصوصیت سے ناواقف ہیں ان معنوں میں ناواقف ہیں کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ سرمائے کی ریاست ۔سرمائے کے فروغ اور سرمائے کی عالمی بالادستی کے لیے لازم ہے کہ امریکی سیاسی قوت کو عالمی بالادستی حاصل ہو اور سرمایہ اور امریکی کی عالمی بالادستی کے قیام کا مقصد یہی ہے اور لازمی نتیجہ بھی یہی ہے کہ سرمائے کی بندگی عام ہو اخلاق رذیلہ عام ہوں اس نظام میں مذاہب اور اسلام نجی زندگی تک محدود ہو جائیں یا مذاہب سرمایہ داری اور اس کے مبادیات، دعوؤں اور وعدوں کا جواز پیش کریں یا اپنے آپ کو مغربی سانچے میں ڈھال لیں تو یہ امریکہ کے ساتھ کوئی مصالحت نہیں ہوگی یہ سرمایہ داری کی بالادستی کو قبول کرنے کا ایک طریقہ ہوگا ۔لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ سرمایہ کی بالادستی کو قبول کیا جائے اور اخلاق رذیلہ کو فروغ پانے کی اجازت دی جائے ۔یہ ممکن نہیں ہے ۔بین الاقوامی نظام میں جب سرمایہ عالمی سطح کے اوپر مرتکز ہو رہا ہے تب امریکہ کی بالادستی کو قبول کرنا سرمائے کی بالادستی قبول کرنے کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ۔سرمائے کی بالادستی کو قبول کرنا اخلاق رذیلہ کے فروغ کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ۔جس سیکولرازم کو یہ سرمایہ داری قائم کرتی ہے وہ اس نوعیت کا سیکولرازم ہے جہاں انفرادی سطح کے اوپر تعین اقدار کو مہمل تصور کیا جاتا ہے اور اکیلے قابل عمل اقدار جو اداراتی شکل اختیار کرتے ہیں وہ صرف حرص وحسد کے اقدار ہوتے ہیں ۔لہٰذا اگر شہادت حق اور دعوت دین کا فریضہ انجام دینا ہے ۔اگر اخلاق حمیدہ کو پھیلانا ہے اگر عبادت رب کو عام کرنا ہے تو عبادت سرمایہ کو رد کرنا ہوگا ۔ اخلاق رذیلہ کا انکار کرنا ہوگا یہ انکار سرمائے کی عالمی بالادستی اور امریکہ کی سیاسی فوقیت کے انکار کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ۔

آپ کس چیز پہ مغرب سے مکالمہ کریں گے؟ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم امریکہ کی اس حیثیت کو پہچانیں اور اس مغالطے میں نہ رہیں کہ بین الاقوامی ادارے کسی معنی میں ہمارے ممالک کے بارے میں کوئی غیر جانبدارانہ (نیوٹرل) حیثیت اختیار کرتے ہیں وہ وہی حیثیت اختیار کرتے ہیں جو سرمائے کو عالمی سطح پہ غالب کرنے کے لیے ضروری ہے اور وہی طریقہ اختیار کرتے ہیں جس کے نتیجے میں سرمایہ محفوظ ہو ۔جس کے نتیجے میں امریکہ کی بالادستی قائم رہے ۔

سرمایہ داری کے اس زبردست غلبے اور عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام کی توسیع کے سلسلے میں طاقت کے زبردست استعمال کے باوجود سرمایہ داری کا مقابلہ کرنے کی استعداد اور گنجائش آج بھی موجود ہے اسلام اور سرمایہ داری چونکہ دو متضاد مذہب ہیں لہٰذا مغرب اور سرمایہ داری سے شدید کشمکش صرف ملت اسلامیہ کو درپیش ہے ۔

یہ موقع ہے کہ ہم مغرب کا علمیاتی محاکمہ کریں اور مغربی تہذیب کو بالکلیہ رد کریں مغربی

تہذیب کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت کی راہ اختیار نہ کریں اصل چیز مغربی تہذیب کو بالکلیہ رد کرنے کی ضرورت ہے ۔مغربی تہذیب کے اندر اسلام کے لیے گنجائش تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔مغربی تہذیب کے اندر گنجائش تلاش کرنے کی روایت عام ہے اور بالخصوص عظیم پاک وہند میں مغربی تہذیب کے اندر اسلام کے لیے گنجائش تلاش کرنے کی بہت سی کوششیں ہوتی رہی ہیں ۔مثلاً بیسویں صدی کے شروع میں ہمارے ہاں یہ خیال عام تھا کہ مغربی تہذیب اسلام کا ہی تتمہ ہے ۔اور بنیادی طور پر تحریک تنویر نے عیسائیت کو رد کر کے جن فلاسفہ اور مفکرین کی طرف رجوع کیا وہ مسلمان ہی تھے ۔چنانچہ مغربی تہذیب بنیادی طور پر اسلامی تہذیب ہی ہے اور اس کا اظہار سرسید، امیر علی، چراغ علی اور دیگر متجددین جیسے پرویز صاحب وغیرہ نے کیا ۔چنانچہ ہمیں بحیثیت مجموعی مغربی تہذیب کو قبول کر لینا چاہیے اور اجتہاد سے ان کی مراد یہی تھی کہ مغربی تہذیب کے سانچے میں اسلام کو ڈھال لینا چاہیے یہ ایک رائے تھی ۔دوسری رائے یہ تھی کہ بحیثیت مجموعی مغربی تہذیب اسلام کا تتمہ نہیں ہے بلکہ مغربی تہذیب کا ایک پہلو یا چند پہلو ایسے ہیں جو اسلامی اقدار کے غماز ہیں مثلاً اگر ہم علامہ اقبال کی تشکیل جدید الٰہیات اسلامی (Reconstruction of Religious thought in Islam) کو دیکھیں تو اس کے اندر یہ دعویٰ موجود ہے کہ مغربی تہذیب کا ایک پہلو مثلاً تجربیت جو ہے وہ اسلام سے کسی نہ کسی حد تک مطابقت رکھتا ہے تو اس دھارے کو استعمال کر کے اسلامی تہذیب کے فروغ کی کوشش کرنا چاہیے۔ تو مغربی تہذیب سے بحیثیت مجموعی مصالحت نہیں بلکہ مغربی تہذیب کے ایک دھارے کے ساتھ ہم اپنا تعلق جوڑ سکتے ہیں اور اس سے فروغ اسلام ممکن ہو سکتا ہے ۔

مغرب اور حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ:

اس معاملے میں علمائے کرامؒ نے جو راہ اختیار کی ابتداءً اگر ہم کسی کا تذکرہ کریں تو وہ شیخ المشائخ قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہے ۔کہ آپ کے ہاں ہمیں جو چیز ملتی ہے وہ یہ ہے آپ نے تین چیزوں کو متحد کرنے کی کوشش کی ۔علوم اسلامیہ کا احیاء، تصوف کی تطہیر اور احیاء اور جہادِ اسلامی ۔ان تینوں چیزوں کو متحد کرنے کے لیے کوشش کی ۔آپ کی شخصیت ان تینوں دھاروں کو مجتمع کرتی ہے ۔تصوف کا فروغ، علومِ اسلامی کا احیاء اور فروغ جہادِ اسلامی ۔آپ جہاد 1857ء کے امیر تھے ۔اور ان معنوں میں آپ نے جس روایت کی بنیاد رکھی وہ مغربی تہذیب کے رد کی بنیاد تھی ۔مغربی تہذیب کے رد کی بنیاد ان معنوں میں تھی کہ آپ نے، آپ کے تلامذہ نے اور وہ لوگ جو آپ کی فکر سے متاثر ہوئے انہوں نے کوشش کی اسلام کو مغربی تہذیب سے بحیثیت مجموعی محفوظ رکھا جائے ۔ اس کی روحانیت کو بھی محفوظ رکھا جائے اور اس کی علمیت کو بھی محفوظ رکھا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ جہاد کو فروغ دیا جائے اور اس چیز کی کوشش کی جائے کہ غلبۂ اسلامی جہاد کے ذریعے برعظیم میں ممکن ہو سکے۔ اس تحریک نے مغربی علوم، مغربی افکار اور مغربی اثرات کا علمی کا محاکمہ نہیں کیا لیکن اس تحریک کے نتیجے میں ہم نے یہ وقیع ترین کام سرانجام دیا کہ اپنے اور اپنے علمی نظام اور روحانی تطہیر کے نظام کو یقیناً

مغرب سے محفوظ رکھا اور علمائے بریلی اور دیوبند کا یہ عظیم ترین کارنامہ ہے کہ مغرب کے سیاسی غلبے کے باوجود علوم اسلامی اور تصوف کے علوم کے اندر مغربی افکار کو ایک انچ گھس آنے کی اجازت نہیں دی۔ اس معاملے میں اگر ہم اپنے اکابر کے کارناموں کا ہندو شنکر اچاریوں کی کارکردگی سے مقابلہ کریں تو دیکھیں گے کہ کتنے بڑے پیمانے پر علمائے کرام اور صوفیائے عظام نے ہمارے اوپر احسان فرمایا۔

مغرب اور ہندو مت:

ہندو تہذیب مکمل مسخر ہو گئی ہے۔ ہندو مت نے مغربیت قبول کر لی۔ گاندھی اور دوسرے مفکرین مثلاً رام موہن رائے نے ان تمام حضرات نے ممکن ہی نہیں رہنے دیا کہ ہندو مت جس شکل میں انگریز کی آمد سے پہلے موجود تھا وہ ویسی شکل میں موجود رہے۔ ٹالسٹائی اور سوشلزم نیشنل ازم اور پتا نہیں کیا کیا اس کے اندر تعمیر کر دیا چنانچہ آج آپ جس چیز کو ہندو مت کا احیاء کہتے ہیں وہ قوم پرستی کے سوا اور کیا ہے۔ ہندو مت کو اسی طریقے سے ہندو علماء نے تباہ کیا جس طریقے سے صیہونیت نے یہودیت کو تباہ کیا۔ علمائے کرام اور صوفیائے عظام کا احسانِ عظیم ہے کہ انہوں نے اسلامی عقائد اور اسلامی علوم کے اس پورے ورثے کو مغربی تہذیب سے محفوظ رکھا جو ہماری کمزوری کے دور میں ہمارے اوپر مسلط ہو سکتا تھا اور جس کے نتیجے میں یہ تمام سرمایہ برعظیم میں تباہ ہو سکتا تھا اور ہم اس عظیم ترین کارنامے کے لیے جتنے زیادہ علمائے کرام اور صوفیائے عظام کے احسان مند ہوں وہ کم ہے لیکن اس کے نتیجے میں ہم نے ابھی تک اس کام کی ابتدا نہیں کی جس کام کے نتیجے میں مغربی تہذیب اور مغربی علوم کی تسخیر اور اسلامی محاکمہ ممکن ہو سکے۔ اس کام کی ابتدا علماء میں سے کچھ افراد نے کی ایسے علماء کا تذکرہ بھی کیا جا سکتا ہے جنہوں نے مغرب کو Seriously لیا۔ جنہوں نے مغربی غلبے اور مغربی بالادستی کو ایک اشو سمجھا اور اس کے مقابلے میں ایسے نوجوان تیار کرنے کی کوشش کی کہ جو خود مغربی تعلیم یافتہ تھے کہ وہ مغرب کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ ایسے علماء کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جنہوں نے مغربی معاشرتی اشو کی تسخیر کی مثلاً پردے کے بارے میں اسلامی احکام کی تصدیق فرمائی اسی تعقل کی بنیاد پر کہ جو عام تھا مغربی تعلیم یافتہ حضرات کے اندر اور سنت کی آئینی حیثیت کے بارے میں وہ پوزیشن بیان کی کہ جو اسلامی پوزیشن ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے علماء ہمارے ہاں موجود ہے جنہوں نے مغرب کو Seriously لیا اور مغرب کو کلیتاً رد کیا۔

امام غزالیؒ کے طریقے پر مغرب کا محاکمہ:

اس وقت جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ امام غزالیؒ کے طریقے پر مغربی علوم کے محاکمے کی تیاری شروع کریں اور امام غزالیؒ کا کام بالخصوص تہافۃ الفلاسفۃ اور احیاءِ علوم دین یہ دو وہ کتابیں ہیں جن کے اندر کفار کے فلاسفہ کی فکر کی تردید کی اسلامی علوم کی بنیاد پر کوشش کی گئی ہے۔ اس وقت ہمارے لیے ضروری یہ ہے کہ ہم اسلامی علوم کی بنیاد کو اتنی وسعت دیں کہ ان کے اندر موجودہ دور کے مسائل کا احاطہ کیا جا سکے۔ جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہم مغربی علوم کے اندر اسلامی روح پھونکنے کی کوشش کریں اس کی گنجائش موجود نہیں مثلاً سوشل سائنسز کو اسلامیانے کی کوششیں کی گئیں

اسلامی معاشیات کا موضوع قائم کرنے کی کوشش کی گئی اسلامی سوشیالوجی کے سلسلے میں جو کام کیا گیا اس کے نتیجے میں جو علمیت پھیلی اس نے سرمایہ داری اور مغربی تہذیب کے بنیادی مفروضوں کو رد نہیں کیا جن کی بنیاد پر یہ سوشل سائنسز قائم ہیں ۔ بلکہ ان مفروضات کی توجیہہ بیان کرنے کی کوشش کی جس کا دوسرا مطلب مغرب کی مغربی فلسفے کی مغربی افکار آدرشوں اور عقائد کی اسلامی نقشہ کشی کرنا تھا۔ اسلامک اکنامکس کے بارے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہاں بنیادی فلسفے کو رد نہیں کرتی جو سرمایہ داری کی روح ہے ۔جدید اکنامکس جو تصور انسان دیتی ہے اس تصور کو اسلامی معاشیات قبول کرتی ہے ۔ کارپوریٹ Personalities کا وہ جواز پیش کرتی ہے سود اور غیر سودی کاروبار میں ایک تعلق کی طرف دعوت دیتی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بنیادی مفروضات اور اصول جس کی بنیاد پر معاشیات کا علم قائم ہوا وہ اسلامی معاشیات میں کبھی زیر بحث ہی نہیں آئے ۔آپ اسلامی معاشیات کے مفکرین کو پڑھ لیں ان کے ہاں ایڈم سمتھ کی Sentiments of Moral Philosophy کا سرے سے کوئی ادراک ہی موجود نہیں حالانکہ ایڈم سمتھ کی جو دوسری کتاب ہے Wealth of Nations وہ نتیجہ ہے Theory of Moral Sentiments کا۔

مغربی معاشیات اور جدید اسلامی معاشیات میں یکسانیت؟

Theory of Moral Sentiments اور انسان کے اس تصور کو جو اس کتاب میں موجود ہے اسے من وعن قبول کر کے اسلامی معاشیات کی عمارت قائم کی گئی جس کے نتیجے میں وہ معاشیات ہی رہی صرف آپ نے اس کو اسلامی اور دینی چولا اور لبادہ اوڑھا دیا ۔اسلامی معاشیات اور Neo Classical Economics میں کیا فرق ہے؟۔ دونوں ایک ہی قسم کے منہاج استعمال کر تے ہیں ایک ہی قسم کے نتائج پر پہنچتے ہیں محض یہ فرق ہے کہ اسلامی معاشیات سرمایہ دارانہ نظام کے اندر چند حدود اور قیود بیان کرتی ہیں اس کے علاوہ اسلامی معاشیات کی کوئی انفرادیت نہیں ۔لہذا یہ ضروری ہے کہ امام غزالیؒ کے طریقے کو عام کر کے ہم ان بنیادوں کو منہدم کردیں جن بنیادوں پر وہ مفروضے قائم ہیں جو اس سائنسی تحقیق کو مروج کرتے ہیں ۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ پہلے مغربی فلاسفہ کی تردید کریں مغربی فلاسفہ کا محاکمہ اسلامی بنیادوں پر کریں ان کی تردید کریں اور مغربی فلاسفہ (Ontological) کے تصورات کو رد کریں ۔ جب تک ہم یہ کام نہیں کریں گے ۔اس وقت تک ہم اپنے ان علوم کو فروغ نہیں دے سکتے اور وسعت نہیں دے سکتے جن کو وسعت دے کر ہم ان مسائل سے کہ جو موجودہ دور سے مختص ہیں اسلامی بنیادوں پر نبرد آزما ہو سکتے ہیں ۔تو ہمارا پہلا کام مغربی فلاسفہ کا جن کے بارے میں نے دوسرے باب میں کچھ عرض کیا ان کا اسلامی محاکمہ اسلامی الہیات اور اسلامی اصولوں کی بنیاد پر کرنے کی ضرورت ہے ۔یہ ہمارا پہلا کام ہے ۔

ایسا اجتہاد جو تقلید کو ممکن بنا سکے:

اس کے بعد یہ بھی ضرورت ہے کہ ہم اپنے قدیم علوم بالخصوص فقہ، کلام اور اصول الدین میں

وہ گنجائش پیدا کریں کہ جس کی بنیاد پر ہم ان مسائل کا حل اسلامی علوم ہی کی بنیاد پر تلاش کرلیں جو اس دور سے مخصوص ہیں ۔ ہمیں علم کی کسی نئی ترکیب کی کوئی ضرورت نہیں اور ہم اجتہاد، تقلیدی اجتہاد کی بنیاد پر کریں ہم اس اجتہاد کی کوشش کریں جس کے نتیجے میں تقلید عام ہو جس کے نتیجے میں سنت پر عمل اس دور میں ممکن اور آسان ہو۔ اجتہاد سے مراد تقلید کو عام کرنا اور سنت کی اتباع کو زیادہ سے زیادہ ممکن بنانا اس کے سوا ہماری نگاہ میں کچھ نہیں یہ اجتہاد ضرورت ہے لیکن یہ اجتہاد مقید ہے اس شرط کے ساتھ کہ اس اجتہاد کے نتیجے میں اتباع سنت اور تصدیقِ اجماعِ امت ہو۔ تصدیقِ اجماعِ امت نہایت ضروری ہے اس لیے کہ تصدیقِ اجماعِ امت کے بغیر ہمارا یہ دعویٰ کہ اسلامی تاریخ عالمگیر ہے۔ اسلامی تاریخ حادثاتی نہیں۔ انبیاء کی تعلیم اور تہذیب ہر دور اور ہر حال میں فوقیت رکھتی ہے۔ یونیورسل ہے لازمہ ہے یہ دعویٰ ہمارا مہمل دعویٰ ہوگا اگر ہم اجماعِ امت سے رجوع کرلیں چنانچہ جس اجتہاد کی ہمیں ضرورت ہے وہ ایسا اجتہاد ہے جو دائرہ علومِ اسلامی کے ماتحت ہو ایسا اجتہاد جو تقلید کو ممکن بناسکے ان اعتقادات کے فروغ کے لیے اجتہادات کی ضرورت ہے۔ جس کے نتیجے میں اجماعِ امت مستحکم ہو جس کے نتیجے میں اجماعِ امت کی بنیاد پر ہم اتباعِ سنت اور تقلید اولیاء رحمہم اللہ کو اس دور میں ممکن بنا سکیں ۔ پہلا کام یہ ہے کہ مغربی مفکرین کے الٰہیات کے مفروضوں کا اسلامی محاکمہ کریں ۔ دوسرا کام اسلامی علوم میں بالخصوص فقہ، کلام اور اصول الدین میں وہ توسیع پیدا کریں جو ہمارے لیے تقلیدی اجتہاد، اجماعِ امت کی بنیاد پر اتباعِ سنت اور اتباعِ اولیاء اللہ ممکن بنا سکے اور یہی بات اسلامی تاریخ کی عالمگیریت کے مترادف ہے ۔ اس کے بعد معاشرتی سطح کے اوپر ہمیں جس چیز کی کوشش کرنا چاہیے وہ یہ کوشش ہے کہ ہم راسخون فی العلم کی قیادت کو معاشرے کی سطح کے اوپر قائم کرنے کی کوشش کریں اور ہمارا بنیادی ادارہ جس کے اردگرد اسلام اداراتی صف بندی ممکن ہو وہ مسجد ہے ۔ جس بنیادی معاشرتی ادارے کی قوت میں اضافہ علماء کی قیادت کے قیام کے لیے لازم ہے وہ ادارہ مسجد کا ادارہ اور مسجد کے ادارے کے فروغ کے لیے دو بنیادی جہتیں ہیں ۔

متوازی غیر سودی نظامِ معیشت:

۱۔ مسجد کو بنیاد بنا کر حلال کاروبار کو فروغ دینا ہماری بہت بڑی ضرورت ہے ۔ جو لوگ اسلامی معیشت کی بات کرتے ہیں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس ملک میں اسلامی معیشت تو موجود ہے۔ اسلامی معیشت کو قائم کرنے کے لیے کسی ریاستی عمل کی ضرورت نہیں ہے ۔محتاط ترین تخمینے کے مطابق 40% کاروبار اس ملک میں ایسا ہو رہا ہے جس میں نہ سود شامل ہے اور نہ سٹہ اس میں شامل ہے ۔ یہی اسلامی کاروبار ہے ۔حلال کاروبار اسلامی کاروبار ہے 40% معیشت اس وقت حلال اور اسلامی معیشت ہے ۔ اس ملک میں اسلامی معیشت موجود ہے اس معیشت کی تنظیم اور ترقی کا بیڑا کسی نے نہیں اٹھایا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حلال کاروبار قائم رہتا ہے لیکن فروغ نہیں پاتا حلال کاروبار بڑا کاروبار نہیں ہو پاتا اور حلال کاروبار بڑا کاروبار اس لیے نہیں ہوتا کہ بڑا کاروبار ہونے کے لیے لازم ہے کہ سود کے بازار یا سٹے کے بازار سے اس کا تعلق ہو ۔ سود اور سٹے کے بازار سے تعلق پیدا کیے بغیر ایک سرمایہ دارانہ معیشت میں چھوٹا

کاروبار بڑا کاروبار نہیں ہو سکتا۔ یہ علمائے کرام اور اسلامی محققین، دانشوروں، فقہاء اور مفکرین کا فرض ہے کہ وہ ایک ایسا نظام قائم کریں جو چھوٹے کاروبار کی اس صلاحیت کو بروئے کار لائے کہ وہ سود اور سٹے کی شمولیت کے بغیر وسعت حاصل کرے اور یہ کوئی ایسا اچنبھے کا کام نہیں ہمیں ایک متوازی پبلک سیکٹر کی ضرورت ہے۔ جو غیر سرمایہ دارانہ پبلک سیکٹر ہو۔ ایک ایسا پبلک سیکٹر ہو جس کا کام یہ ہو کہ وہ ان وسائل کو جو ہمارا یہ چھوٹا کاروبار پیدا کر رہا ہے ان وسائل کو شراکت کی بنیاد پر اس طریقے سے منظم اور تقسیم کریں کہ چھوٹا کاروباری اپنے کاروبار کو بڑے کاروبار میں بدلنے کی صلاحیت پیدا کر سکے۔

معاشرے پر مسجد کی حکومت:

یہ کاروبار جنوبی ہند میں، کسی نہ کسی حد تک کامیابی کے ساتھ لبنان میں اور دیگر کئی ممالک کی میں مثال دے سکتا ہوں، ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ ہم مسجد کو بنیاد بنا کر غیر سودی بنیادوں کے اوپر پیسہ جمع کرنا اور پیسے کو استعمال کرنے کا ایک نظم قائم کریں جس کا مقصد سرمائے کی بڑھوتری نہ ہو بلکہ جس کا مقصد پاک دولت کی اور اسلامی قوتوں کی قوت میں اضافہ ہو۔ مسجد کو ایک معاشی ادارہ بنانا اور مسجد کو ایک ایسا ادارہ بنانا جس کی بنیاد کے اوپر وہ حلال کاروبار جو اس وقت اس ملک میں ہو رہا ہے منظم اور مروج ہو سکے یہ ایک اہم چیلنج ہے۔ بازار میں مسجد کی حتمی حیثیت کو قائم کرنا اور محلے میں مسجد کی فیصلہ کن حیثیت کو قائم کرنا فروغ اسلام کے لیے ضروری ہے۔ مسجد کے دو بنیادی کردار ہیں ایک معاشی کاروبار کو مروج و مرتب کرنا۔ دوسرا محلے کی سطح کی انتظامیہ اور عدلیہ کو اپنے ہاتھ میں لے لینا۔ بنیادی طور پر ہم اپنے محلوں اور برادریوں کو مسجد کے انتظام میں دینا چاہتے ہیں اکیلی جائز مقامی حکومت جس کے ہم قائل ہیں مسجد کی حکومت ہے ہم اپنے محلوں کو اور ہم اپنے بازاروں کو مسجد کے تسلط میں دینا چاہتے ہیں انہی معنوں میں تمام قوت مسجد کے ہاتھ میں ہو جس کی بنیاد پر لوگوں کو منظم ہونا چاہیے۔ مقصد یہ ہے کہ تمام قوت مسجد میں مرتکز ہو اور مسجد کی بالادستی محلے کی سطح پر اور بازار کی سطح پر قائم ہو۔ یہ کوئی اجنبی بات نہیں ہماری سابقہ اور موجودہ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ مسجد کی یہ بالادستی بازار کے اوپر، برادری کے اوپر اور محلے کے اوپر قائم کی جا سکتی ہے۔ جس کے نتیجے میں دینی اخلاقیات، دینی روایات، دینی شعائر محفوظ رہیں گے اور ہم سرمایہ داری کے امراض سے بھی بچ جائیں گے۔ لیکن ضرورت اس میں یہ ہے کہ علماء اپنا منصب پہچانیں اور علماء قیادت کی ذمہ داری کو قبول فرمائیں وہ قیادت رونما ہو جو محلے اور بازار کی سطح پر اسلام کو بحیثیت ایک قوت کے منظم کرے اور اس طریقے سے منظم کرے کہ اخلاق حمیدہ بازار میں بھی، محلے میں بھی اور برادریوں کی زندگی میں بھی فروغ پائیں یہ معاشرتی حکمت عملی ہے۔

سیاسی سطح پر بھی نہایت تدبر، حکمت، تدبیر اور عزم نو کی ضرورت ہے عالمی حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قدم پورے شعور کے ساتھ اٹھے قومی، علاقائی، عالمی حالات، سرمایہ داری اور اس کی حکمت عملی پر ہماری نظر ہو۔ غیر ضروری مباحث و معاملات میں الجھنے کے بجائے نہایت مدبرانہ اور مستقل نوعیت کی حکمت عملی اختیار کی جائے جذباتی کشمکش کے بجائے ٹھوس علمیاتی بنیادوں پر کارواں کو تیز قدم کیا جائے

(۹۶) چھیانوے

اور ایسی سیاست سے گریز کیا جائے جس کے نتیجے میں مغربی آدرش عام ہوں اور لوگوں کے تزکیہ نفس و تطہیر قلب کا خاص اہتمام کیا جائے۔

و اخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين